سلسلہ اشاعت اردو اکادمی ۱۳



ذکریٰ

تفسیر الفرقان فی معارف القرآن

کا

وہ حصہ جس میں پارہ عم کی تفسیر ہے

از

خواجہ محمد عبد الحیٔ فاروقی

مطبوعہ مطبع محبوب المطابع برقی پریس دہلی باہتمام میرزا محبوب بیگ

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

مکی اور مدنی تقسیم

مفسرین کرام نے قرآن حکیم کی سورتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک کا نام مکی ہے اور دوسرے کو مدنی کہتے ہیں، دونوں حصوں کی بعض نمایاں اور ممتاز خصوصیات حسب ذیل ہیں

مکی سورتیں

(۱) ان میں زیادہ تر جذبات کا لحاظ کیا گیا ہے۔

(۲) دعوت و تبلیغ اسلام پر زور ہے، طرز خطاب میں بھی نرمی اور ملاطفت پیش نظر ہے اور جہاد کا ذکر نہیں۔

(۳) فواصل کا لحاظ رکھا گیا ہے اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے۔

(۴) الفاظ پر عظمت اور شان دار ہیں۔

(۵) توحید، قیامت، اور عبرت و موعظت پر مشتمل ہیں۔

(۶) اعمال و عبادات کا مطالبہ بہت کم ہے، زیادہ تر عقائد سے بحث کی گئی ہے۔

(۷) یہود و نصاریٰ سے کوئی جھگڑا نہیں۔

(۸) چھوٹی چھوٹی آیتیں اور چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔

مَدَانی سُورتیں

(۱) خیالات میں گہرائی اور عمق ہے۔

(۲) نشر و اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ جہاد کا بھی حکم ہے۔

(۳) فواصل کی طرف توجہ نہیں کی گئی، اور جو ہیں تو وہ بڑے بڑے ہیں۔

(۴) قانونی الفاظ ہیں۔

(۵) احکام اور قوانین ہیں۔

(۶) اعمال اور عبادات کا سب سے زیادہ مطالبہ ہے۔

(۷) اہل کتاب سے باقاعدہ مناظرہ ہے۔

(۸) بڑی بڑی آیتیں اور بڑی بڑی سورتیں ہیں۔

اسی فرق کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یوں بیان فرماتی ہیں:

انما نزل اول ما نزل منہ سورۃ من المفصل فیہا ذکر الجنۃ والنار، حتیٰ اذا ثاب الناس الی الاسلام ثم نزل الحلال والحرام، ولو نزل اول شیء لا تشربوا الخمر، لقالوا لا ندع الخمر ابداً، ولو نزل لا تزنوا، لقالوا لا ندع الزنا ابداً، لقد نزل بمکۃ وانا جاریۃ العب بل الساعۃ موعدہم، والساعۃ ادھیٰ وامر، وما نزلت سورۃ البقرۃ والنساء الا وانا عندہ (بخاری) ابتداء میں سور مفصل نازل ہوئیں، جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر تھا پھر جب لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو احکام کا نزول شروع ہوا، اور اگر پہلے ہی روز شراب اور زنا ترک کرنے کو کہا جاتا تو لوگ صاف انکار کر دیتے، جب یہ آیت نازل ہوئی: بل الساعۃ موعدہم والساعۃ ادھیٰ وامر، تو میں اس وقت مکہ کی گلیوں

میں کھیلا کرتی تھی، اور سورۂ بقرہ و نساء کا نزول اس وقت ہوا جب میں خود رسول اللہ کے پاس موجود تھی۔

اس کی حکمت

مدنی سورتوں میں تدبیر منزل، سیاست مدن، اور خلافت کبریٰ کے احکام و ضوابط، اور امت کی تشکیل و تنظیم کے اصول و قوانین پر بحث کی گئی ہے، اور مکی سورتوں میں توحید، قیامت، رسالت اور اخلاق فاضلہ پر زور دیا گیا ہے، یہ نمایاں امتیاز اس لیے ہے کہ اگر ابتدا ہی میں اہل عرب کو اعمال فاسقہ کو چھوڑنے اور مدنی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا تو بہت کم لوگ اس صدا پر لبیک کہتے اس لیے ان لوگوں کی اصلاح و تہذیب کے لیے یہ حکیمانہ صورت اختیار کی گئی کہ شروع میں انھیں جزائے اعمال کی طرف توجہ دلائی گئی، اور یہ بتا دیا گیا کہ ایک ایسی قوت قاہرہ بھی موجود ہے جو تمہارے ایک ایک عمل حیات کو گہری نظر سے دیکھ رہی ہے، وہ تمہارے کسی کام کو ضائع نہ ہونے دے گی تمھیں اس کا بدلہ ضرور مل کر رہے گا، اور اس وقت کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی تمہاری مدد نہ کر سکے گی، بلکہ ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار اور جوابدہ ہوگا۔

رسول کی ضرورت

جب ایک شخص خدا کے وجود اور اپنی ذمہ داری و مسئولیت کو دل کے ساتھ یقین کر لے تو اُسے خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس کرے گا کہ اُسے اخلاق فاضلہ اور جرائم کا علم ہو تا کہ وہ معاصی سے پرہیز کر کے نیکی کی راہ اختیار کر سکے، مگر خود انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ماحول سے متاثر ہو کر اپنی فطرت صالحہ کے صاف و شفاف آئینہ کو گرد آلود کر لیتا ہے، حجاب طبع، حجاب رسم اور حجاب سوءِ معرفت اُس کے قلب سلیم کو بالکل تاریک و مظلم بنا دیتے ہیں: ظلمت بعضھا فوق بعض، اور وہ اس طرح راہ حق سے منحرف ہو جاتا ہے، اس لیے قدم قدم پر اس کو ایک ہادی اور رہبر کی ضرورت ہے جو اس کو نیکی اور بدی کی راہ دکھائے اور رستہ کے تمام نشیب و فراز سمجھا دے، یہی وجہ ہے کہ ہر مسلم قانت دن میں پانچ وقت اللہ کے حضور میں کھڑا

اہدنا الصراط المستقیم کی دعا مانگتا ہے۔

پس قرآن کریم نے فطری طریق تعلیم اختیار کیا، جب خدا کے وجود اور اپنی ذمہ داری کو وہ لوگ سمجھ گئے تو انھیں بتایا گیا کہ اس اللہ کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کے لیے وہ اپنا رسول بھیجتا ہے، اس کے پاس اس کے احکام و فرامین ہوتے ہیں، تمہارا فرض ہے کہ اس کا اتباع کرو تاکہ راہ حق پا سکو: فاما یاتینکم منی ہدی فمن تبع ہدای فلا خوف علیہم ولا ہم یحزنون، والذین کفروا وکذبوا بایتنا اولئک اصحاب النار ہم فیہا خلدون (۲: ۳۸ و ۳۹) جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہونچے تو اس کی پیروی کرو، تو جنھوں نے میری ہدایت کی پیروی کی، ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے اور جنھوں نے اس کو قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ میں جانے والے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

قلب القرآن

چنانچہ اگر آپ مکی سورتوں کو مدنی حصہ سے الگ کرلیں تو آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائیگی کہ ان سورتوں میں زیادہ تر توحید، رسالت اور جزائے اعمال پر زور دیا گیا ہے، اگر اعمال کی طرف توجہ کی گئی ہے تو بہت کم، اس لیے کہ عمل نتیجہ ہے عقائد صالحہ اور یقین و اذعان کا، جب تک ایک خیال آپ کے دل میں محکم و استوار نہ ہوگا اس سے داعیۂ عمل کے پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے عملاً قانونی زندگی مدینہ منورہ ہی سے شروع ہوتی ہے۔

دنیا میں جس قدر انبیاء و رسل مبعوث ہوئے، ان سب میں اصول و کلیات کے اعتبار سے ذرہ برابر بھی فرق نہیں، سب کے سب انھیں عقائد و یقینیات کی دعوت دیتے ہیں، جن پر تمام مذاہب و ادیان متفق ہیں، اور وہ ہی توحید، رسالت اور قیامت ہیں، یہی وجہ ہے کہ سورۂ یٰسین کو حدیث میں قلب القرآن کہا گیا، کیونکہ اس میں ان ہی اہمات مسائل پر بحث کی گئی ہے، سورۂ اخلاص میں صرف توحید کا ذکر تھا، اس لیے لسان نبوت نے اس کو ثلث قرآن فرمایا۔

اس تمہید کو پیش نظر رکھ کر اگر آپ تیسویں پارہ میں درس و فکر کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی اکثر سورتوں میں یہی تین چیزیں زیر بحث و نظر ہیں، مگر ہر ایک سورۃ کا طریق استدلال و استشہاد دوسری سے بالکل جداگانہ ہے، اور ہر جگہ انداز گفتگو نرالا، جاذب قلوب و انظار اور پر از عبرت و بصیرت ہے۔



النبا

موضوع سورت (رکوع ۲ - آیات ۴۰)

اس وقت سورۃ النبا آپ کے سامنے ہے، اس کا موضوع اثبات قیامت ہے، یہی مقصد اور بھی کئی ایک سورتوں کا ہے، مگر اس کا طریق بحث ونظر سب سے الگ ہے، اس میں کاشت کاروں کو مخاطب کیا گیا ہے، اور ان ہی چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کھیتی باڑی کے لیے ضروری ہیں، ظاہر ہے کہ کسان جس قدر محنت کرتا ہے، اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کھیتی تیار ہو جانے کے بعد اس کو کاٹ لے، اور غلہ الگ کر کے بھوسا جانوروں کے آگے ڈال دے، پس جس طرح ہر کاشت کار کے نزدیک فصل کاٹنے کا دن مقرر ہے، ایسے ہی انسانوں کے فنا کرنے کا بھی ایک وقت معین ہے، اس روز اچھوں اور بروں میں تمیز ہوگی، اور ہر ایک اپنے کیے کا بدلہ پائے گا، اس دن کا نام یوم الفصل ہے، اور اسی دن کی چند خصوصیات بیان کر کے آخر سورۃ میں اسی کا اعادہ کیا ہے، یہی اس سورۃ کا موضوع ہے۔

جزائے اعمال پر زور

قرآن مجید کا بڑا حصہ اسی کے بیان پر مشتمل ہے، اور اس پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ کفار و معاندین اسلام کو سب سے زیادہ اس کے متعلق شکوک و شبہات ہیں، کوئی یہ کہتا ہے: من یحی العظام وھی رمیم (۳۶ : ۷۸) جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو انہیں کون زندہ کرے گا، کسی کا یہ خیال ہے: وما اظن الساعۃ قائمۃ (۱۸ : ۳۶) اور نہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت برپا ہو، بعض کی یہ رائے ہے: ما ھی الا

حیاتنا الدنیا نموت ونحیٰ وما یھلکنا الا الدھر (۴۵ : ۲۴) ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ ہمیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے، ایک جماعت کے خیالات یہ ہیں: واذا قیل ان وعد اللہ حق والساعۃ لا ریب فیھا قلتم ما ندری ما الساعۃ ان نظن الا ظنا وما نحن بمستیقنین (۴۵: ۳۲) اور جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں تو تم کہتے تھے ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا، کبھی یوں سوال کرتے: متیٰ ہذا الوعد (۳۶ : ۴۸) یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔

غرض یہ کہ مخالفین اسی قسم کے خیالات اس عقیدہ صالحہ کے متعلق ہمیشہ سے ظاہر کرتے آئے ہیں اس میں غلط فہمی پیدا ہونے کی وجہ سے کسی نے تناسخ کی پناہ لی، نصاریٰ نے کفارہ کو اپنے گناہوں کی آڑ بنا لیا، اور بعض لوگ تو سرے ہی سے اس کا انکار کر بیٹھے گویا انہوں نے اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کو بالکلیہ فراموش کر دیا اور اگر یہی عقیدہ لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا صرف کھیل اور کود کا گھر بن جائیگی کسی کو بھی نیکی کی طرف توجہ نہ ہوگی، زمین کا سنگار لٹ جائے گا، ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے گی اور اکثر فرزندان آدم مجسمۂ ملعونیت و شیطنت بنجائینگے۔

عیسائی اقوام کی حالت تمہارے سامنے ہے جو انسانوں کی صورت میں درندوں اور بھیڑیوں کی طرح اپنے ہی بھائیوں کو چیرتے اور پھاڑتے ہیں: وہم یحسبون انہم یحسنون صنعا (۱۸ : ۱۰۴) اور وہ اپنی غلط فہمی سے اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں یہ کفارہ کے نتائج ہیں اور حریت فاسقہ کے ثمرات۔

پس اس شر و طغیان کو روکنے کے لیے جزائے اعمال پر زور دیا گیا کہ ہر ایک انسان اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے اور اپنی مسئولیت کا خیال کر کے ہر کام میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اس کے نتائج و ثمرات میں اچھی طرح غور و فکر کر لے۔

یوم الفصل

عظیم الشان خبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ (۲) عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ (۳) الَّذِیۡ هُمۡ فِیۡهِ مُخۡتَلِفُوۡنَ۔

شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں، کیا بڑی خبر کی نسبت جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔

نبا عظیم سے کیا مراد ہے؟ اس میں علمائے کرام کے مختلف اقوال ہیں، قتادہ کی رائے ہے کہ اس سے مراد قیامت ہے، اسی طرف ضحاک گئے ہیں، اسی کو رازی اور ابن کثیر نے ترجیح دی ہے اور اسی کی تائید قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ ایک جگہ فرمایا: قل ہو نبأ عظیم انتم عنہ معرضون (۳۸: ۶۷، ۶۸) کہدو کہ یہ ایک بڑی ہولناک چیز کی خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے، دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: الا یظن اولئک انہم مبعوثون لیوم عظیم، یوم یقوم الناس لرب العالمین، (۸۳: ۴ تا ۶) کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اٹھائے بھی جائیں گے یعنی ایک بڑے سخت دن میں، جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے، اس کے علاوہ سورۃ کا انداز بیان، طریق استدلال اور خواتیم آیات اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں کہ اس میں صرف مسئلہ قیامت پر بحث کی گئی ہے، اور اس لیے نبا عظیم سے مراد قیامت ہے۔

قرآن نے اس موضوع پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے، اور ہر جگہ مختلف طریق سے اس پر

نظر ڈالی ہے کہ اس کے تمام پہلو سامنے آجائیں' اس لیے کہ یہی ایک مسئلہ ہے جس کی نسبت لوگوں میں سب سے زیادہ اختلاف ہے، یہودیوں کے بعض فرقے اس کا کلیتہً انکار کرتے ہیں' نصاریٰ حشر معاد روحانی کے قائل ہیں' ہندو تناسخ کی صورت میں جزا سزا تسلیم کرتے ہیں' مشرکین عرب ازراہ تعجب کہا کرتے تھے: ءاذا متنا وکنا ترابا ذلک رجع بعید (۵۰ : ۳) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہوگئے تو پھر زندہ ہوں گے' یہ زندہ ہونا بعید از عقل ہے، کبھی وہ یوں کہتے: ءانا لمردودون فی الحافرۃ' ءاذا کنا عظاما نخرۃ (۷۹ : ۱۰ ، ۱۱) کیا ہم الٹے پاؤں پھر لوٹیں گے' بھلا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہوجائیں گے۔

اس شدید اختلاف کی وجہ سے قرآن نے بھی اس پر نہایت ہی جامع اور حاوی بحث کی، ایک جگہ اس نے اثبات قیامت پر یوں استدلال کیا: وضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ، قال من یحی العظام وہی رمیم' قل یحییہا الذی انشاہا اول مرۃ' وہو بکل خلق علیم (۳۶ : ۷۸ ، ۷۹) اور ہمارے بارہ میں مثالیں بیان کرنے لگا' اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی تو کون زندہ کرے گا، کہدو کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا' اور وہ سب قسم کا پیدا کرنا جانتا ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں نہایت ہی لطیف پیرایہ میں اس پر روشنی ڈالی:

وقالوا ءاذا کنا عظاماً ورفاتا، ءانا لمبعوثون خلقا جدیدا، قل کونوا حجارۃ اوحدیدا، اوخلقا مما یکبر فی صدورکم' فسیقولون من یعیدنا، قل الذی فطرکم اول مرۃ، فسینغضون الیک رءوسہم ویقولون متی ہو، قل عسیٰ ان یکون قریبا (۱۷ : ۴۹ تا ۵۱) اور کہتے ہیں کہ جب ہم مر کر بوسیدہ ہڈیاں اور چورہ چورہ ہوجائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے، کہدو کہ خواہ تم پتھر ہوجاؤ' یا لوہا' یا کوئی اور چیز جو تمھارے نزدیک پتھر اور لوہے سے بھی بڑی سخت ہو' جھٹ کہیں گے کہ بھلا ہمیں دوبارہ کون

جلائے گا، کہدو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا، تو تعجب سے تمہارے آگے سر ہلائیں گے، اور پوچھیں گے کہ ایسا کب ہوگا، کہہ دو امید ہی کہ جلد ہوگا۔

کہیں یوں جواب دیا: افعیینا بالخلق الاول بل ہم فی لبس من خلق جدید (۵۰: ۱۵) کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں، نہیں بلکہ یہ از سر نو پیدا کرنے میں شک میں پڑے ہوے ہیں، ایک مقام پر انسانی پیدائش سے یوں استدلال کیا: الم یک نطفۃ من منی یمنی، ثم کان علقۃ فخلق فسوی فجعل منہ الزوجین الذکر والانثی، الیس ذلک بقدر علی ان یحیی الموتی (۷۵: ۳۷ تا ۴۰) کیا وہ منی کا جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا، پھر لوتھڑا ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا، پھر اُس کے اعضا کو درست کیا پھر اُس کی دو قسمیں بنائیں، ایک مرد اور ایک عورت، کیا اس خالق کو اس بات پر قدرت نہیں کہ مُردوں کو جلا اُٹھائے۔

ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا: الم یروا ان اللہ الذی خلق السموت والارض ولم یعی بخلقھن بقدر علی ان یحی الموتی، بلی انہ علی کل شئی قدیر (۴۶: ۳۳) کیا انھوں نے نہیں سمجھا کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، وہ اس بات پر بھی قادر ہی کہ مردوں کو زندہ کر دے، ہاں ہاں وہ ہر چیز پر قادر ہی، سورۂ ذاریات میں نزول باراں اور اُس کی مختلف کیفیات سے استدلال کر کے کہا: انما توعدون لصادق، وان الدین لواقع، (۵۱: ۵و۶) جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہی وہ سچا ہی، اور انصاف کا دن ضرور واقع ہوگا، غرض یہ کہ اس بحث کا کوئی پہلو نہیں جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔

ایک نکتہ

(۴) کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ (۵) ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ — دیکھو یہ عنقریب جان لیں گے پھر دیکھو یہ عنقریب جان لیں گے۔

ارباب تفسیر نے ان دونوں آیتوں کے مطلب میں ثم کی وجہ سے اختلاف کیا ہی، جو تراخی کے

لیے آتا ہی، بعض کی یہ رائے ہو کہ اس تکرار سے صرف تاکید کا اظہار مقصود ہی، ضحاک کہتے ہیں کہ پہلی آیت کفار کے لیے اور دوسری مسلمانوں کے واسطے ہی، ہر ایک جماعت اپنے اپنے عقائد کے ثمرات ونتائج کو دیکھ لے گی، کچھ لوگ اس طرف بھی گئے ہیں کہ پہلی آیت نزع سے تعلق رکھتی ہی اور دوسری قیامت سے۔

اس میں شک نہیں کہ ثم کی وجہ سے ہر ایک بزرگ نے اس فرق کو بیان کرنے کی کوشش کی ہی جو ان دونوں آیتوں میں ہونا چاہیئے، مگر ہمیں ان سب سے اختلاف ہی، وجہ اس کی یہ ہو کہ اول تو ہم قرآن میں کسی آیت اور قصہ کے تکرار کے قائل نہیں، اگر ایک ہی آیت کئی جگہ آجائے تو ہر مقام پر اس کا مطلب جداگانہ ہوگا، جو سیاق وسباق کو پیش نظر رکھ کر معین کیا جا سکتا ہی یہی حال قصص القرآن کا ہی، وشرح ذلک یطول، دوسرے اگر اس تمام انکار کا نتیجہ مرنے ہی کے بعد ظہور پذیر ہوگا، تو یہ تمام بحث ونظر، اور جدل ومناظرہ بے کار ٹھہرتا ہی۔

ظاہر ہو کہ ذمہ داری اور مسئولیت کا انکار کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی زندگی کو اپنی تمام کائنات حیات تصور کرتے ہیں: ما ہی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحی وما یہلکنا الا الدھر، (۴۵: ۲۴) ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہو کہ ہمیں مرتے اور جیتے ہیں، اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہی، مگر ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر قیامت کا ہونا ان کے نزدیک بعید از عقل اور خارج از امکان ہی تو ہم اسی سورت میں ایسے دلائل وبراہین بیان کیے دیتے ہیں جن سے ان کے تمام شکوک وشبہات یک قلم رفع ہو جائیں گے، اور اگر باوجود ان روشن شواہد وبینات کے پھر بھی وہ تسلیم نہ کریں اور اپنی ہٹ پر قائم رہیں تو اس ضد کا تو کوئی علاج نہیں، مرنے کے بعد یہ حقیقت مستورہ خود بخود بے حجاب ہو جائے گی اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ شدید ترین غلطی میں مبتلا تھے: واقسموا باللہ جھد ایمانہم لا یبعث اللہ من یموت، بلیٰ وعداً علیہ حقاً ولکن اکثر الناس لا یعلمون لیبین لہم الذی یختلفون

فیہ لیعلم الذین کفروا انہم کانوا کذبین (۱۶: ۳۸ و ۳۹) اور یہ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے، خدا اسے قیامت کے دن قبر سے نہیں اٹھائے گا، ہرگز نہیں یہ خدا کا وعدہ سچا ہے، اور اس کا پورا کرنا اسے ضرور ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے، اور اس لیے کہ کافر جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

تشریح الفاظ

(۶) اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (۷) وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (۸) وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (۹) وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (۱۰) وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (۱۱) وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (۱۲) وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (۱۳) وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (۱۴) وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (۱۵) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا (۱۶) وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا۔	کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا، اور پہاڑوں کو اس کی میخیں نہیں ٹھہرایا، بے شک بنایا اور تم کو جوڑا جوڑا بھی پیدا کیا، اور نیند کو تمھارے لیے موجب آرام بنایا، اور رات کو پردہ مقرر کیا، اور دن کو معاش کا وقت قرار دیا، اور تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے، اور آفتاب کا روشن چراغ بنایا، اور نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینھ برسایا، تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں، اور گھنے گھنے باغ۔

سبات لیا گیا ہے سبت سے اس کے لغوی معنی قطع کرنے کے ہیں نیند سے دن بھر کی تکلیف دور ہوتی، اور تکان قطع ہوتی ہے اس لیے اس کو سبات کہا گیا، یوم السبت یعنی آرام کا دن یہودیوں نے جو غلط باتیں اللہ کی طرف منسوب کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خدا نے چھ روز میں آسمان و زمین کو بنا لیا تو اپنی تھکن کو دور کرنے کے لیے اس نے شنبہ کے روز آرام کیا۔ معاش مصدر ہے عاش یعیش سے یعنی وقت معاش، شداد جمع ہے شدیدۃ کی اس کے معنی مضبوط کے ہیں، وہاج کے معنی خوب روشن ہونے کے ہیں معصرات سے مراد بادل ہیں، ثج کہتے ہیں شدت کے ساتھ بہنے کو

اور یہ لازم و متعدی دونوں طریق پر استعمال ہوتا ہے، لازم کی مثال تو اسی آیت میں موجود ہے، اور متعدی کی مثال وہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا: افضل الحج العج والثج، بہترین حج وہ ہے جس میں بلند آواز سے تلبیہ کہا جائے اور کثرت سے جانوروں کا خون بہایا جائے۔

مناظر قدرت سے استدلال

ہم نے موضوع سورت پر بحث کرتے وقت بیان کیا تھا کہ اس سورت کا رخِ سخن کاشتکاروں کی طرف ہے، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ان آیات میں وہی چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کی کسان کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے، اگر وہ ان میں درس فکر کرے گا تو ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ قیامت کا ہونا ایک یقینی امر ہے۔

قرآن مجید کا یہ مخصوص انداز ہے کہ جب کبھی وہ تذکیر و موعظت کرتا ہے تو غیر متعارف و نامانوس چیزوں کو پیش نہیں کرتا، بلکہ وہی روزمرہ کی چیزیں ہیں جن کو ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں، مگر ذہن ان کی طرف منتقل نہیں ہوتا، : یمرون علیھا وھم عنھا معرضون، یہی مناظر قدرت ہیں، نجوم و کواکب ہیں اور ثوابت و سیارات ہیں جن کی جانب وہ ہمیں توجہ دلاتا ہے کہ ہم ان سے عبرت اندوز ہوں اور ان سے استدلال و استشہاد کا کام لیں : وفی الارض آیات للموقنین، وفی انفسکم افلا تبصرون (۵۱: ۲۰ و ۲۱) اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں۔

ان آیات میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ کسی شرح و تفصیل کی محتاج نہیں، ایک کسان ہی ان کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے، وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، کھیتی کو پانی دیتا ہے، دن رات اس کی حفاظت کرتا ہے، ایک مدت کی حفظ و نگہداشت کے بعد اس کا کھیت لہلہانے لگتا ہے فصل بالکل تیار ہو جاتی ہے، اب وقت آتا ہے کہ وہ اس کو کاٹ لے۔

قیامت کا دن

(۱۷) اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا۔ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ جب کھیت تیار ہوتا ہے تو پھر اُسے کاٹ لیا جاتا ہے، اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ کھیت کا مالک اپنی فصل کو اسی طرح میدان میں کھڑا رہنے دے گا ایسے ہی تم یقین کر لو کہ اللہ تعالےٰ نے بھی انسانوں کے فنا کرنے کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے اُس روز ان کی دنیاوی ترقی رک جائے گی، ان سب کو ایک مقام پر جمع کر دیا جائے گا، اور ہر ایک اپنے کیے کا بدلہ پائے گا: یوم یجمعکم لیوم الجمع ذلک یوم التغابن (۶۴ : ۹) جس دن وہ تم کو اکٹھا ہونے یعنی قیامت کے دن اکٹھا کرے گا، وہ نقصان اُٹھانے کا دن ہے۔

یہی یوم الفصل ہے جس روز اچھوں اور بُروں کو الگ کر دیا جائے گا جس طرح کاشت کار فصل کاٹ لینے کے بعد غلہ اور بھوسہ کو الگ الگ کر دیتا ہے: ان الذین آمنوا، والذین ہادوا، والصابیئن والنصری والمجوس والذین اشرکوا ان اللہ یفصل بینہم یوم القیمۃ (۲۲ : ۱۷) جو لوگ مومن یعنی مسلمان ہیں، اور جو یہودی ہیں اور ستارہ پرست، اور عیسائی اور مجوس، اور مشرک خدا ان سب میں قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، سورۃ السجدہ میں فرمایا: ان ربک ہو یفصل بینہم یوم القیمۃ فیما کانوا فیہ یختلفون (۳۲ : ۲۵) بلاشبہ تمہارا پروردگار ان میں جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے تھے، قیامت کے روز فیصلہ کر دیگا۔

ایک کسان کی زندگی اس نظارہ سے واقف ہے، وہ ہمیشہ یہی کام کرتا ہے، اسی طرح قیامت کے روز اعمال صالحہ کرنے والوں کو اللہ تعالےٰ جنت میں داخل کر دے گا، اور بروں کو جہنم میں: ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم (۸۲ : ۱۳ و ۱۴)

آثار و قرائن

(۱۸) یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ جس دن صور پھونکا جائے گا، تو تم لوگ غٹ کے غٹ آ

اَفْوَاجًا(؁) وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا (۲۰) وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا۔

موجود ہوگے، اور آسمان کھولا جاے گا، تو اس میں دروازے ہوجائیں گے، اور پہاڑ چلاے جائیں گے تو وہ ریت ہوکر رہ جائیں گے۔

ان آیات میں قیامت کے بعض ابتدائی حوادث کا ذکر کیا گیا ہی، بارش نازل ہونے سے قبل سرد ہوا چلتی ہے تو لوگوں کو یقین ہوجاتا ہی کہ باران رحمت کا نزول ہوگا، اور زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہوجاے گی، اسی طرح جب قیامت برپا ہوگی تو اس وقت قدرت الٰہیہ اپنا اثر دکھائیگی تمام مردوں میں زندگی پیدا ہوجائے گی اور سب کے سب اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر مختلف گروہوں میں تقسیم ہوجائیں گے: یوم ندعوا کل اناس بامامھم (۱۷ : ۷۱) جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواوں کے ساتھ بلائیں گے۔

موجودہ نظام شمسی درہم برہم ہوجاے گا، نجوم وکواکب کا نام ونشان باقی نہ رہیگا: اذا السماء انفطرت، واذا الکواکب انتثرت (۸۲ : ا و ۲) جب آسمان پھٹ جاے گا، اور جب تارے جھڑ پڑیں گے، آسمان میدان محشر کے لیے دروازوں کی شکل میں بدل جاے گا: یوم تشقق السماء بالغمام ونزل الملائکۃ تنزیلا، (۲۵ : ۲۵) اور جس دن آسمان ابر کے ساتھ پھٹ جائے گا، اور فرشتے نازل کیے جائیں گے اور پہاڑوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ ہوا میں اُڑتے دکھائی دیں گے، جب موجودہ نظام ہی نہ رہا تو تمام قوانین میں بھی تبدیلی ہونا ضروری ہی، ہر اس کشش کا سلسلہ بھی ختم ہوجاے گا جو پہاڑوں کو اپنی جگہ پر قائم وثابت رکھے ہوے تھی، اب اس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ خلا میں پھیل جائیں۔

پہاڑوں کے مختلف حالات

قرآن مجید نے علامات قیامت بیان کرتے ہوے پہاڑوں کی مختلف حالتیں اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے ذکر کی ہیں، ہم ان کے بعض حالات کو ایک سلسلہ میں بیان کیے دیتے ہیں کہ آیات

کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے:

ان کی پہلی حالت یہ ہوگی: وحملت الارض والجبال فدکتا دکتہ واحدۃ (۶۹: ۱۴) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھا لیے جائیں گے، پھر ایک بارگی توڑ پھوڑ کر برابر کر دیے جائیں گے۔

پھر یہ ہوگا: یوم یکون الناس کالفراش المبثوث وتکون الجبال کالعھن المنفوش (۱۰۱: ۴ و ۵) وہ قیامت ہے جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے، اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے رنگ برنگ کی دھنکی ہوئی اون۔

اس کے بعد کی کیفیت یہ ہے: اذا رجت الارض رجا وبست الجبال بسا فکانت ھباء منبثا (۵۶: ۴ تا ۶) جب زمین بھونچال سے لرزنے لگے، اور پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں، پھر غبار ہو کر اڑنے لگیں۔

سورۂ طٰہٰ میں یوں آتا ہے: ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفا فیذرھا قاعا صفصفا لاتری فیھا عوجا ولا امتا (۲۰: ۱۰۵ تا ۱۰۷) اور تم سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ خدا ان کو اڑا کر بکھیر دے گا، اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا جس میں نہ تم کجی اور پستی دیکھو گے، نہ ٹیلا اور بلندی، تری الجبال تحسبھا جامدۃ وھی تمر مر السحاب میں بھی اسی کی ایک حالت بیان کی گئی ہے (۲۷: ۸۸) اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ اپنی جگہ پر کھڑے ہیں، مگر وہ اس روز اس طرح اڑتے پھریں گے جیسے بادل، اور ایک کیفیت یہ ہے: ویوم نسیر الجبال وتری الارض بارزۃ (۱۸: ۴۷) اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے، اور تم زمین کو صاف میدان دیکھو گے۔

پہاڑوں کی سب سے آخری شکل وہ ہوگی جو آیت زیر بحث میں بیان کی گئی ہے، جہاں کل تک سر بفلک پہاڑ کھڑے تھے، قیامت کے روز تو دیکھے گا کہ وہ اب چٹیل میدان ہیں، اب نہ تو

انسان کے چھپنے کے لیے کوئی جگہ باقی ہے اور نہ وہ اپنے آپ کو اپنے اعمال کی بازپرس سے محفوظ رکھ سکتا ہے، بلکہ ہر ایک شخص کو اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے کاموں کا جواب دینا ہوگا: فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔

نتائج اعمال۔

(۲۱) اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (۲۲) لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا (۲۳) لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا (۲۴) لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (۲۵) اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا (۲۶) جَزَآءً وِّفَاقًا۔

بے شک دوزخ گھات میں ہے یعنی سرکشوں کا وہی ٹھکانا ہے اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے، وہاں نہ ٹھنڈک کا مزا چکھیں گے، نہ کچھ کھانا پینا نصیب ہوگا، مگر گرم پانی اور بہتی پیپ یہ بدلا ہے پورا پورا۔

جن لوگوں نے دنیا میں اپنی صورت نوعیہ کو خراب کر دیا، اور اپنی فطرت صالحہ کے صاف و شفاف آئینہ کو خارجی اثرات ضلالت سے گرد آلود کر دیا، وہ اس گھاس اور بھوسہ کی طرح ہوں گے جو جانوروں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے اور وہ اس کو پاؤں کے نیچے روندتے ہیں ان تمام انسانوں کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو ان کی تاک میں لگی ہوگی، یہ اس جگہ مدت ہائے دراز تک رہیں گے، شدت حرارت کی وجہ سے انھیں پانی کی تلاش ہوگی، مگر ان کی تمام سعی و کوشش بے کار جائیگی اور یہ ان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ہوگا: وما ربک بظلام للعبید، سورۂ انعام میں آتا ہے: ومن جاء بالسیئۃ فلا یجزی الا مثلھا وھم لا یظلمون (۶: ۱۶۰) اور جو برائی لائے گا، اسے سزا ویسی ہی ملیگی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

عذاب کا سبب

(۲۷) اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا (۲۸)

یہ لوگ حساب آخرت کی امید ہی نہیں رکھتے تھے، اور

وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا (۲۹) وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا (۳۰) فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا۔

ہماری آیتوں کو جھوٹ سمجھ کر جھٹلاتے رہتے تھے اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر ضبط کر رکھا ہی، سواب مزا چکھو ہم تم پر عذاب ہی بڑھاتے جائیں گے۔

اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کو دو قوتیں نوازش فرمائی ہیں:

(الف) قوت نظریہ کہ ہر ایک کام کی حقیقت اصلیہ معلوم کرلے۔

(ب) قوت عملیہ اس تلاش وتحقیق کے بعد اس پر عمل پیرا بھی ہو۔

ان لوگوں کو سخت ترین عذاب اس لیے ہو رہا ہی کہ انھوں نے اپنی دونوں قوتوں کو برباد کردیا، انھیں اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کا مطلق خیال نہ تھا، اور وما اظن الساعة قائمة کہہ کر قیامت کا انکار کرتے تھے، پھر اسی کے ساتھ اس تعلیم کی بھی تکذیب کرتے جو انھیں جزائے اعمال کیطرف متوجہ کرتی۔

علم النفس میں یہ مسئلہ اجلی بدیہیات سے ہی کہ انسان خواہ کیسا ہی حقیر سے حقیر کام کیوں کرے اس کا اثر ضرور باقی رہتا ہے اور اس شخص کو اس کا بدلہ ملتا ہی، اگر اس نے نیکی کی ہی تو کم از کم آئندہ نیک کاموں میں اس کو مدد ملے گی، اور اگر اس نے برائی کا ارتکاب کیا ہی، تو اسے بدکرداری کا شوق پیدا ہوگا، اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہی: فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی، فسنیسرہ للیسری، واما من بخل واستغنی، وکذب بالحسنی فسنیسرہ للعسری (۹۲ : ۵ تا ۱۰) تو جس نے خدا کے رستے میں مال دیا اور پرہیزگاری کی، اور نیک بات کو سچ جانا، اس کو ہم آسان طریقہ کی توفیق دیں گے، اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا، اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا، اُسے سختی میں پہنچائیں گے، ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا: واللیل وما وسق، والقمر اذا اتسق لترکبن طبقاً عن طبق۔ (۸۴ : ۱۷ تا ۱۹) اور رات کی قسم اور جن چیزوں کو وہ اکٹھا کرلیتی ہی، ان کی اور چاند کی جب کامل ہوجاتے، کہ تم درجہ بدرجہ رتبۂ اعلیٰ پر چڑھو گے۔

اسی حقیقت نفس الامری کو آیت وکل شیٔ احصینہ کتابا میں بیان کیا، اگرچہ یہ لوگ اپنے اعمال فاسقہ کو بھول جائیں، مگر ان کے ایک ایک کام پر ہماری نظر ہے اور ان کے تمام اعمال حیات کو ہم نے محفوظ رکھا ہے: احصہ اللہ ونسوہ، (۵۸ : ۶) خدا کو وہ سب کام یاد ہیں، اور یہ ان کو بھول گئے پس آج جو کچھ مل رہا ہے یہ اپنے ہی اعمال کے نتائج ہیں اور اس لیے عذاب کے سوا اور کیا چیز مل سکتی ہے؟

ارباب تقوی

گذشتہ آیات میں ان لوگوں کا تذکرہ تھا جو اعمال فاسقہ کی وجہ سے بالکل بے کار ہو چکے ہیں اور اب ان میں اور حیوانوں میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہا ہے، شرالبریہ ہیں، یہی الاعمی ہیں، یہی اولئک کالانعام بل ہم اضل کے مصداق حقیقی ہیں، اور یہی الذین لایعلمون کے گروہ میں داخل ہیں اس لیے ان کی وہی حیثیت ہے جو بھوسہ کی ہوا کرتی ہے۔

آیندہ آیات میں ان ارباب صلاح وتقوی کا بیان ہے جن کی تمام تر زندگی نیکی میں گذری ہے، جن پر ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین کا رنگ غالب ہے، اور جو قلب سلیم لیکر مالک یوم الدین کے دربار میں حاضر ہوں گے:۔

(۳۱) اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا (۳۲) حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا (۳۳) وَّکَوَاعِبَ اَتْرَابًا (۳۴) وَّکَاْسًا دِھَاقًا (۳۵) لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا وَّلَا کِذّٰبًا (۳۶) جَزَآءً مِّنْ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا (۳۷) رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا الرَّحْمٰنِ لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا۔

بے شک پرہیزگاروں کے لیے کامیابی ہے، یعنی باغ اور انگور، اور ہم عمر نوجوان عورتیں، اور شراب کے چھلکتے ہوئے گلاس وہاں نہ بیہودہ باتیں سنیں گے، نہ جھوٹ خرافات یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے صلہ ہے انعام کثیر، وہ جو آسمانوں اور زمین اور جو ان دونوں میں ہے، سب کا مالک ہے، بڑا مہربان کسی کو اس سے بات کرنے کا یارا نہ ہوگا۔

مفاز مصدر ہے، اور اس کے معنی کامیاب ہونے کے ہیں، حدائق [illegible]

جو چار دیواری سے گھرا ہوا ہو، اور یہ حدیقہ کی جمع ہی، کواعب جمع ہی کاعب کی، یہ کعب سی ماخوذ ہی جس کے معنی کسی چیز کے اُبھرنے کے ہیں، کعب ٹخنے کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ دونوں طرف سے اُبھرا ہوا ہوتا ہی، اس لیے کاعب اُس نوجوان عورت کو کہا جاتا ہی جس کا سینہ اُبھرا ہوا ہو، دھاقا اضداد میں سے ہی، اس کے معنی بھرنا اور خالی کرنا، دونوں آتے ہیں، اس جگہ بھرنے کے معنی ہیں۔

جنت کی حقیقت

آیات مذکورۃ الصدر میں جو نعمتیں بیان کی گئی ہیں، وہ صرف ارباب تقویٰ کے لیے مخصوص ہیں، قرآن نے مختلف الفاظ میں جنت کے مخصوصات کو بیان کیا ہی: فیہا ما تشتہیہ الانفس و تلذ الاعین و انتم فیہا خالدون (۴۳: ۷۱) وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھوں کو اچھا لگے، موجود ہوگا، اور اے اہل جنت، تم اس میں ہمیشہ رہو گے، دوسری جگہ آتا ہی: وہم فی ما اشتہت انفسہم خلدون، (۲۱: ۱۰۲) اور جو کچھ ان کا جی چاہے گا اُس میں یعنی ہر طرح کے عیش اور لطف میں ہمیشہ رہیں گے، سورۂ حجر میں فرمایا: ادخلوہا بسلم آمنین، و نزعنا ما فی صدورہم من غل اخوانا علی سرر متقبلین، لا یمسہم فیہا نصب و ما ہم منہا بمخرجین، (۱۵: ۴۶ تا ۴۸) ان سے کہا جائے گا کہ ان میں سلامتی اور خاطر جمع سے داخل ہو جاؤ، اور ان کے دلوں میں جو کدورت ہوگی اُن کو ہم نکال کر صاف کر دیں گے، گویا بھائی بھائی تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوے ہیں، نہ ان کو وہاں کوئی تکلیف پہنچے گی، اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے، حدیث میں آتا ہی: ما لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر، نہ آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سُنا، اور نہ کسی دل میں اس جنت کی نعمتوں کا وہم و گمان بھی گذرا۔

کتاب و سنت کی ان تصریحات کے بعد کون شخص یہ دعوی کر سکتا ہی کہ یہی دنیا جنت ہی، اس عالم کون و فساد میں جنت کا ہونا غیر ممکن ہی، اس لیے کہ یہاں نیکی اور بدی، خیر اور شر، اور رنج و راحت کا اس درجہ اختلاط و التباس ہی کہ دونوں کا جدا کرنا محال قطعی ہی، اور جنت ایسی جگہ ہے کہ یہاں لطف و

سرور کے سوا کوئی چیز نہیں، اور اگر قرآن و حدیث کے ان ارشادات کے ساتھ یہ بھی ملا لیا جائے کہ یہ الطافہائے گوناگوں اس اللہ کی طرف سے نوازش ہوں گے، جو زمین و آسمان کا مالک ہے، اور جس کی صفت رحمت ہر جگہ کارفرما ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لطف و نوازش بھی کرے اور اس میں شائبہ تکلیف بھی ہو، اس لیے جنت وہی ہو سکتی ہے جس میں راحت و آرام کے سوا کچھ نہ ہو، اور یہ دنیا اس کی جگہ نہیں

اس روز جو کچھ ملے گا وہ خدائے قدوس کی رحمت کا نتیجہ ہوگا، پھر جب زمین و آسمان کا مالک دینے پر آئے تو اس کی دین کا کیا پوچھنا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ جو کچھ ہے اس کا فضل ہی فضل ہے، کوئی شخص اپنے استحقاق کی بنا پر اس سے اپنا حق نہ طلب کر سکے گا، اس کی جلالت و کبریائی، اور ہیبت و جبروت کی یہ کیفیت ہوگی کہ بغیر اجازت اس سے کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑے گی۔

کس روز

(۳۸) یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔

جس دن روح اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے تو کوئی بول نہ سکے گا، مگر جس کو خدائے رحمٰن اجازت بخشے اور اس نے بات بھی درست کہی ہو۔

اسی دن یہ نتائج نکلیں گے، اس روز کائنات ارضی و سماوی کی مرکزی روح بھی حاضر ہوگی جو اپنی مرکزیت کی بنا پر تمام اجزائے کائنات میں عموماً اور جملہ افراد نوع انسانی میں خصوصاً باعتبار انعام و تعذیب موثر ہے، اسی کے عکس کی بدولت تمام ارواح میں زندگی کے آثار نمایاں تھے، ملائکہ بھی اس روز موجود ہوں گے، جو مختلف قوتوں کے مظاہر تھے، اور جن کو لوگوں نے غلطی سے اللہ کی بیٹیاں بنا رکھا تھا: واتخذ من الملائکۃ اناثا، (۱۷: ۴۰) وہ بھی دربار خداوندی میں صف بستہ اپنی عاجزی

و درماندگی کا اظہار کر رہے ہوں گے: وجاء ربک والملک صفاً صفاً (۸۹: ۲۲) تجلیات الہیہ کا ظہور ہوگا، شہنشاہ زمین و آسمان کی جلالت قدر کے باعث سب کے سب بے بس ہوں گے، اور کسی کو یارائے تکلم نہ ہوگا: یومئذ یتبعون الداعی لاعوج لہ، وخشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا ہمسا (۲۰: ۱۰۸) اس روز لوگ ایک پکارنے والے کے پیچھے چلیں گے، اور اس کی پیروی سے انحراف نہ کر سکیں گے، اور خدا کے سامنے آوازیں پست ہو جائیں گی تو تم آواز خفی کے سوا کوئی آواز نہ سنو گے۔

البتہ وہی شخص بول سکے گا، جس کو اللہ خود اجازت فرما دے اور بولنے والا بھی سچ سچ کہے: یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن ورضی لہ قولا (۲۰: ۱۰۹) اس روز کسی کی سفارش کچھ فائدہ نہ دیگی مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے اور اس کی بات پسند فرمائے۔

رجوع الی المقصود

(۳۹) ذٰلِکَ الْیَوْمُ الْحَقُّ، فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا (۴۰) اِنَّآ اَنْذَرْنٰکُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا یَّوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا۔

یہ دن برحق ہے، پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنا لے، ہم نے تم کو عذاب سے جو عنقریب آنیوالا ہے آگاہ کر دیا ہے، جس دن ہر شخص ان اعمال کو جو اُس نے آگے بھیجے ہوں گے دیکھ لیگا، اور کافر کہے گا کہ اے کاش میں مٹی ہوتا۔

جس قدر دلائل ہم نے اوپر بیان کیے ہیں ان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ قیامت ضرور ہونے والی ہے، اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا: ان الدین لواقع، اگر طلبہ کو امتحان کا یقین نہ ہو، تو وہ کبھی اپنا وقت درس و مطالعہ میں صرف نہ کریں گے، اگر سپاہی کو باز پرس کا خوف نہ ہو تو وہ رات کے وقت اپنا عیش و آرام ترک کر کے پاسبانی نہ کرے گا، ایسے ہی اگر ہمارے اعمال ضائع جاتے ہیں اور ان کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، تو دنیا صرف کھیل اور تماشہ کا گھر رہ جاتی ہے اور

عقل سلیم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

پس جزائے اعمال یقینی ہے، اور ہم سے باز پرس ہوگی، تو اب جس کا جی چاہے اپنے اخلاق میں تہذیب و شائستگی پیدا کرلے کہ اس کو دربارِ الٰہی میں تقرب حاصل ہو اور تمام اقوام عالم کے سامنے اس کو ذلیل نہ ہونا پڑے: یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ (۳: ۱۰۶) اس روز بہت سے چہرے سفید ہونگے اور بہت سے سیاہ۔

یہ عذاب کچھ دور نہیں، بلکہ سر پر کھڑا ہے، قیامت کے روز جب کفار سے سوال کیا جائے گا کہ تم دنیا میں کتنی مدت رہے تو وہ جواب دیں گے: لبثنا یوما او بعض یوم ایک دن پورا یا اس کا کچھ حصہ، دوسری جگہ آتا ہے کہ جس وقت قیامت کا ہولناک منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا تو وہ یوں خیال کریں گے: کانہم یوم یرونہا لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحٰہا: (۷۹: ۴۶) جب وہ اس کو دیکھیں گے تو ایسا خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں صرف ایک شام یا صبح رہے تھے، حدیث میں آتا ہے: بعثت انا والساعۃ کھاتین جس طرح یہ دونوں انگلیاں باہم دگر ملی ہوئی ہیں، اسی طرح میرے بعد اب قیامت ہی آنے والی ہے، درمیان میں اور کوئی نبی نہیں آئے گا، دوسری حدیث میں آتا ہے: من مات فقد قامت قیامتہ مرنے کے بعد انفرادی اعمال کا حساب کتاب فوراً شروع ہو جاتا ہے، اجتماعی افعال کی باز پرس اس وقت ہوگی جب تمام نوع انسانی ایک میدان میں جمع ہو جائے، پہلی قیامت صغریٰ ہے، اور دوسری قیامت کبریٰ۔

اس روز ہر شخص اپنے تمام اعمال دیکھ لے گا: ووجدوا ما عملوا حاضرا، ایک جگہ یوں ارشاد ہے: ینبؤا الانسان یومئذ بما قدم واخر (۷۵: ۱۳) اس دن انسان کو جو عمل اس نے آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے ہوں گے سب بتا دیئے جائیں گے، ان اعمال فاسقہ کو دیکھ کر اس کو بے حد ندامت ہوگی، اور شرم کے مارے گڑ جائیگا، اس لیے ہر وہ شخص جس میں نوع انسانی کے قانون کا کامل ظہور نہ ہوا ہوگا اس کی یہ خواہش ہوگی کہ مٹی بن جائے اور کسی قسم کا احساس اسمیں باقی نہ رہے مگر یہ آرزو بیکار رہ جائے گی: یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوی بھم الارض ولا یکتمون اللہ حدیثا (۴: ۴۲) اس روز کافر اور پیغمبر کے نافرمان آرزو کریں گے کہ کاش ان کو زمین میں مدفون کر کے مٹی برابر کر دی جاتی، اور خدا سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔

النازعات

(آیات ۴۶ - رکوع ۲)

موضوع سورۃ

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو ذمہ دار اور مسئول پیدا کیا گیا ہے، اس سے یقیناً ایک روز باز پرس ہوگی اور اسے اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے گا، اگر وہ ذرا غور و فکر سے کام لے تو اس کی زندگی کے روزانہ واقعات اس عقیدۂ صالحہ کی شہادت دیں گے، مگر اس کی غفلت اور خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ روزمرّہ وہ ان بینات و شواہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور پھر بھی اس مسئولیت کی طرف اس کی توجہ منعطف نہیں ہوتی: یمرون علیھا وھم عنھا معرضون۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بار بار اس کا ذکر کرتا ہے، تاکہ انسان کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اس کے نتائج و ثمرات میں بھی اچھی طرح غور و فکر کر لے، چنانچہ سورۂ نازعات کا بھی وہی موضوع ہے جو سورۂ نبا کا تھا، مگر انداز گفتگو اور طریق استدلال اس سے بالکل جداگانہ ہے۔

ابتدائی پانچ آیات میں فرشتوں کے مختلف فرائض بیان کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جب اس وقت وہ اللہ کا ہر حکم ماننے کے لیے ہمہ تن تیار رہتے ہیں، اور اس کی تعمیل میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کرتے تو یاد رکھو اسی طرح انہیں صرف فرمان خداوندی کا انتظار ہے، فوراً اس تمام کائنات ارضی و سماوی کو نیست و نابود کر دیں گے، اور کسی چیز کا بھی نام و نشان باقی نہ رہے گا، پھر آیت ۶ سے ۱۴ تک بتایا کہ قیامت کی

نسبت جو تمہارے دل میں شبہات ہیں کہ وہ ایک نہایت ہی مشکل کام ہے، تو ان تمام شکوک کو دل سے نکال دو اس لیے کہ وہ صرف ایک ڈانٹ ہوگی، اور تم سب کے سب میدان حشر میں خوف زدہ موجود ہوگے۔

اگر اب بھی تمھیں یہ خیال ہے کہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح تباہ ہوگا تو تاریخ عالم کی ورق گردانی کرو، اور فرعون کے جاہ وحشمت، قوت وطاقت اور پھر تباہی و بربادی کو اپنے سامنے لاؤ، یہی ایک واقعہ تمہارے لیے عبرتوں اور بصیرتوں کا دروازہ کھول دے گا۔ آیت ۲۶ تک یہی مضمون ہے۔

انسان کو اپنی نسبت کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ بھلا میں کس طرح فنا ہو کر دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہوں، اس پر فرمایا کہ تم پہاڑوں کو دیکھو، دن اور رات میں غور کرو، زمین اور اس کے دریاؤں کی طرف نظر دوڑاؤ، پھر بتاؤ ان تمام چیزوں کا پیدا کرنا مشکل تھا یا تمہارا، آیت ۳۳ سے بتایا گیا کہ اگرچہ اس وقت تمھیں کسی قسم کا احساس نہیں ہوتا، مگر جب وہ حادثۂ کبریٰ رونما ہوگا، اس دن تمھیں اپنے تمام اعمال یاد آجائیں گے، مگر اس وقت نصیحت حاصل کرنا بے کار ہوگا، اس روز تو نتائج نکلیں گے، جن لوگوں نے دنیاوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی، وہ جہنم میں جائیں گے، اور ارباب ایمان جنت میں، آیت ۴۱ تک یہی مضمون ہے۔

جب اس قسم کے ہولناک نتائج انسان کے سامنے آتے ہیں تو وہ اتنی بات تو ضرور تسلیم کر لیتا ہے کہ قیامت یقیناً آئے گی، مگر چونکہ ابھی تک استبعاد اس کی طبیعت میں باقی ہے، اس لیے اب یہی خیال دوسری صورت اختیار کرتا ہے، اور وہ پوچھتا ہے کہ اتنا بڑا حادثہ کب رونما ہوگا تاکہ اس تاریخ سے قبل مناسب تیاری کر لی جائے، ظاہر ہے کہ رسول کا یہ کام نہیں، اس کا فرض انذار و تبشیر ہے اور بس نہ وہ اس تاریخ کی تعیین سے واقف ہے اور نہ اس کے دائرۂ عمل میں یہ بات داخل ہے کہ اس کا علم حاصل کرے، ہاں اس کے آثار و قرائن کا اس کو علم ہے اور انھیں اس نے تمہارے سامنے من و عن بیان کر دیا ہے، اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے، اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے، البتہ اتنی بات یاد رہے کہ جب وہ وقت آئے گا، تو دنیا کی تمام زندگی تمہارے نزدیک صرف ایک شام یا صبح کے مانند معلوم ہوگی، اور اسی پر سورت کو ختم کر دیا۔

رفع استبعاد قیامت

اقسام القرآن

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۲) وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (۳) وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (۴) فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا (۵) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔

ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں اور اُن کی جو آسانی سے کھول دیتے ہیں اور اُن کی جو تیرتے پھرتے ہیں پھر لپک کر آگے بڑھتے ہیں پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مختلف چیزوں کی قسمیں بیان کی ہیں ان کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان چیزوں کو اپنے دعاوی کے ثبوت میں بطور شواہد و بیّنات کے پیش کیا گیا ہے، ان کی عظمت اور جلالت قدر ذکر کرنا مقصود نہیں جیسا کہ عام طور پر مفسرین کرام کا خیال ہے اور غالباً اسی لئے امام فخرالدین رازی نے والتین والزیتون کی تفسیر میں ان کے طبّی فوائد شمار کیے ہیں ایک انسان کوئی دعوی کرتا ہے، اور اس کے ثبوت میں گواہ لاتا ہے، لیکن جب اس کے پاس گواہ نہیں ہوتے تو وہ قسم کھاتا ہے یعنی جس چیز کی قسم کھاتا ہے اس کو وہ آخری اور قطعی شہادت کی شکل میں پیش کرتا ہے یہی مطلب اقسام القرآن کا ہے، مگر اسی کے ساتھ اتنا اور ذہن نشین کر لیجیے کہ با اوقات ہمارے دعوی اور قسم میں کوئی ربط اور تعلق نہیں ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ جو قسمیں بیان فرماتا ہے ان کا دعوی کے ساتھ

بہترین تعلق ہوتا ہے، اس دعوی کی تصدیق آپ کو اُس وقت ہوگی جب آپ ہماری تمام کتاب پڑھ لیں گے
عربی زبان میں کئی الفاظ قسم کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ان کا باہمی
فرق بیان کر دیں تا کہ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

(۱) قسم اس کے معنی شہادت کے ہیں، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو برابر استعمال کرتا ہے
(۲) یمین، اس کے اصلی معنی توکیل اور ذمہ داری کے ہیں، اور یہ معاملات کے زیادہ مناسب ہے۔
(۳) ایلاء یہ بالکل نذر اور منت کے معنی میں ہے اس کا استعمال اس وقت ہوتا ہے، جب آپ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد کریں، مگر عموماً اس کا استعمال ضرر کے لیے مخصوص ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔
(۴) حلف، ادنیٰ درجہ کے لوگ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، شریف انسان اس کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بہت زیادہ ارفع واعلیٰ ہے، قرآن نے خود اس کی مذمت کی ہے: ولا تطع کل حلاف مہین (۶۸: ۱۰) اور کسی ایسے شخص کے کہنے میں نہ آجانا جو بہت قسمیں کھانے والا اذلیل اوقات ہے۔

رجوع الی المقصود

اس قدر تمہید کے بعد اب آپ اس سورت کی قسموں میں غور کیجیے، جن کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں، مگر حافظ ابن کثیر نے صرف ایک ہی قول کو صحیح قرار دیا ہے ان کی رائے یہ ہے کہ ان تمام اقسام سے فرشتے مراد ہیں، اور ان کے مختلف اعمال کی ان آیات میں تشریح کی گئی ہے، ابن مسعود، ابن عباس، مسروق، سعید بن جبیر، ابو صالح، اور ابو الضحیٰ اسی طرف گئے ہیں، اور یہی ہمارا خیال ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ کفار کے نزدیک مشکل ترین مسئلہ یہی ہے کہ قیامت کس طرح ہو سکتی ہے، اور وہ

بار بار اپنے تعجب کا اظہار کرتے ہیں، ان آیات میں فرشتوں کے مختلف اقسام اور ان کے فرائض کی طرف ان منکرین قیامت کو متوجہ کیا گیا ہے، ان میں سے بعض فرشتے وہ ہیں جو کفار کی روح قبض کرنے پر معین کیے گئے ہیں، چونکہ ان لوگوں نے اپنی تمام زندگی غیر ذمہ دارانہ طریق پر بسر کی ہوئی ہے، اس لیے مرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اور ہر ممکن طریق سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے، تو ان کی روح جسم کے ہر ایک کونے میں چھپتی ہے کہ شاید نجات کی کوئی صورت نکل آئے، اس لیے فرشتوں کو ان کے جسم کے ایک ایک کونہ کی تلاش کرکے ان کی روح کو نکالنا پڑتا ہے۔

مگر ان کے برخلاف ایک مسلمان اللہ کے نام پر ہر وقت مرنے کو تیار رہتا ہے، وہ نہایت مسرت و شادمانی سے اپنی جان عزیز خدا کے سپرد کر دیتا ہے، اور فرشتوں کو ان کی روح قبض کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

ہم اپنی تفسیر میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے ملائکہ پیدا کیے ہیں اور ہر جماعت کے فرائض جداگانہ ہیں، اگر ایک جماعت حافین حول العرش ہے تو دوسری حملۃ العرش، بعض وہ فرشتے ہیں جو آسمان و زمین کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں، وہ صرف حکم خداوندی کے منتظر ہیں جس وقت وہاں سے کوئی حکم ملتا ہے، فوراً آگے بڑھتے ہیں کہ سب سے پہلے میں اس کو لے لوں، ارشاد خداوندی کے بعد سب کے سب اپنے فرائض کی بجا آوری میں اس طرح مصروف ہو جاتے ہیں کہ انہیں دنیا جہان کی مطلق خبر نہیں رہتی۔

فرشتوں کی خصوصیت

قرآن کریم نے اگرچہ فرشتوں کے مختلف اقسام بیان کیے ہیں، مگر خصوصیت سب کی ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے: لا یعصون اللہ ما امرہم ویفعلون ما یؤمرون، (۶۶ : ۶) جو ارشاد خدا ان کو فرماتا ہے اس کی

نافرمانی نہیں کرتے، اور جو حکم ان کو ملتا ہے، اُسے بجا لاتے ہیں' اس صفت کو پیش نظر رکھ کر کفار کو یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ آج جس طرح وہ ان فرائض کی بجا آوری میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کرتے اسی طرح جب مالک السمٰوٰت والارض اس کائنات عالم کو فنا کرنے کا ارادہ کرے گا تو صرف ایک اشارۂ کن کافی ہوگا، اور یہ تمام فرشتے ایک ہی آن میں سب کچھ نیست و نابود کر دیں گے: وللہ غیب السمٰوٰت والارض، وما امر الساعۃ الا کلمح البصر او ہو اقرب' ان اللہ علی کل شیٔ قدیر، (۱۶ : ۷۷) اور آسمانوں اور زمین کا علم خدا ہی کو ہے، اور خدا کے نزدیک قیامت کا آنا یوں ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا بلکہ اس سے بھی جلد تر، کچھ شک نہیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، سورۃ القمر میں فرمایا:

وما امرنا الا واحدۃ کلمح بالبصر، (۵۴ : ۵۰) اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے۔

پس کفار و منکرین قیامت اسے کچھ مشکل خیال نہ کریں ان اقسام سے عبرت اندوز ہوں اور اس آنے والے دن کے لیے تیار ہو جائیں۔

اظہار تعجب

(۶) یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ (۷) تَتۡبَعُہَا الرَّادِفَۃُ (۸) قُلُوۡبٌ یَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ (۹) اَبۡصَارُہَا خَاشِعَۃٌ (۱۰) یَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِی الۡحَافِرَۃِ (۱۱) ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَۃً (۱۲) قَالُوۡا تِلۡکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ (۱۳) فَاِنَّمَا ہِیَ زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ (۱۴) فَاِذَا ہُمۡ بِالسَّاہِرَۃِ۔

(غرض روز قیامت ضرور آنے والا ہے) جب کہ زمین لرز جائے، اور زلزلے کے بعد زلزلہ آئے، اس دن بہت سے دل دھڑک رہے ہوں گے، ان کی نظریں جھکی ہوئی ہوں گی، کہتے ہیں کہ کیا ہم مرے پیچھے پھر اُلٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے، کیا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے، کہتے ہیں کہ ایسا ہوا تو یہ لوٹنا نقصان کی بات ہے، سو قیامت کی بس اتنی حقیقت ہے کہ ایک ڈانٹ تباہی اور ایک دم سے سب لوگ میدان حشر میں آ موجود ہوئے۔

راجفۃ، رجف زلزلے کو کہتے ہیں، رادفۃ، ہر وہ چیز جو ایک چیز کے بعد آئے، اسی سے ردیف شعر ہے، واجفۃ، وجاف کہتے ہیں ڈرنے اور مضطرب ہونے کو، حافرۃ، حفر سے جس کے معنی کھودنے کے ہیں، اس سے مراد قبریں، نخرۃ پرانے اور بوسیدہ ہونے کو کہتے ہیں، ساہرۃ، میدان۔

حادثہ قیامت جب رونما ہوگا، تو اس سے قبل مسلسل یکے بعد دیگرے زلزلے آئیں گے، جیسا کہ جدید ترین تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے، اس وقت لوگوں کی کیفیت یہ ہوگی کہ خوف و دہشت کے مارے سب کے دل دھڑک رہے ہوں گے، اور اپنے اعمال اور ان کے نتائج کو یاد کرکے ان کی آنکھیں شرم و ندامت اور حسرت و یاس میں نیچے جھکی ہوں گی۔

کفار و مشرکین کے سامنے جب اس حادثہ کبریٰ کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، تو وہ تمسخر و استہزا کرتے ہیں، اور ہنسی کے طور پر کہتے ہیں کہ کیا واقعی قبروں میں پھر دوسری مرتبہ زندگی ملے گی، بھلا کیا سڑگل جانے کے بعد پھر ہڈیاں درست ہو جائیں گی، بے شک اگر ایسا ہوا تو یہ لوٹنا یقیناً نقصان کا موجب ہوگا، یہ لوگ قیامت کو بعید از عقل و فہم خیال کرتے ہیں، انھیں کسی طرح بھی یقین نہیں آتا کہ ایسا ممکن ہے، اس لیے وہ اس خیال پر ہنستے ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ خدائے قادر و توانا کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں، صرف ایک حکم کی دیر ہے کہ سب کے سب اس کے روبرو ایک میدان میں جواب دینے کے لیے موجود ہو جائیں گے: ونفخ فی الصور فصعق من فی السموٰت ومن فی الارض الا من شاء اللہ، ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ہم قیام ینظرون، (۳۹: ۶۸) اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر وہ جس کو خدا چاہے، پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے، دوسری جگہ آتا ہے: یوم یدعوکم فتستجیبون بحمدہ وتظنون ان لبثتم الا قلیلا، (۱۷: ۵۲) جس دن وہ تمھیں پکارے گا، تو تم اس کی تعریف کے ساتھ جواب دوگے، اور خیال کروگے کہ تم دنیا میں بہت کم مدت رہے۔



فرعون کی ہلاکت

اگران لوگوں کو اب بھی شک اشتباہ ہے، اوران کے خیال میں یہ بات نہیں آسکتی کہ اتنا بڑا کارخانہ کس طرح فنا کیا جا سکتا ہے کہ اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے، تو انھیں چاہیئے کہ وہ ذیل کے واقعہ میں غور وفکر سے کام لیں، اس سے ان کے تمام شبہات زائل ہو جائیں گے:

(۱۵) هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (۱۶) اِذْنَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱۷) اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۱۸) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى (۱۹) وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۲۰) فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى۔

موسیٰ کا قصہ بھی تم کو پہنچا ہے جب کہ ان کو طوی کے میدان پاک میں ان کے پروردگار نے پکار کر فرمایا کہ موسیٰ! فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے بہت سر اٹھا رکھا ہے، اور کہو کہ بھلا تجھ کو اس کی بھی کچھ فکر ہے کہ تو پاک صاف ہو جائے، اور میں تجھ کو تیرے پروردگار کی طرف کا رستہ دکھاؤں اور تو اس سے ڈرے چنانچہ موسیٰ نے جا کر اسکو بڑا معجزہ دکھایا۔

کوہ طور کے دامن میں جو وادی ہے اس کا نام طویٰ ہے، چنانچہ ایک جگہ آتا ہے: ونادیناہ من جانب الطور الایمن وقربنہ نجیا، (۱۹ : ۵۲) اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب پکارا، اور باتیں کرنے کے لیے نزدیک بلایا۔

ان آیات میں فرعون کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جو مصر کا سب سے زیادہ جابر اور متکبر بادشاہ تھا، جس نے انتہائی ظلم وجور پر کمر باندھ رکھی تھی، اور جو اپنے تمرد وعصیان کے نشہ باطل میں اس قدر مست تھا کہ اپنے آپ کو انا ربکم الاعلیٰ کہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت وراہ نمائی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، جنہوں نے اس کو ہر قسم کے معجزات دکھائے کہ وہ عبرت پکڑے۔

عبرۃ لمن یخشیٰ۔

(۲۱) فَكَذَّبَ وَعَصٰى (۲۲) ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى (۲۳) فَحَشَرَ فَنَادٰى (۲۴) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۲۵) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۲۶) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى۔

تو اس نے جھٹلایا، اور نافرمانی کی، پھر لوٹ گیا، اور لگا موسیٰ کے خلاف تدبیریں کرنے، یعنی لوگوں کو جمع کیا، اور ان میں یوں منادی کرادی، اور کہہ دیا کہ میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں، تو اس کو خدا نے آخرت اور دنیا میں دھر پکڑا، بیشک جو شخص ڈرتا ہے اس کے لیے اس میں بڑی عبرت ہے۔

نکال بمعنی تنکیل، اس عذاب کو کہتے ہیں جسے لوگ دیکھکر یا سن کر عبرت پکڑیں، اس کے اصلی معنی منع کرنے کے ہیں، چونکہ تعذیب بھی لوگوں کو ان باتوں کے کرنے سے روکتی ہے جن کا نتیجہ تعذیب ہو، اس لیے تنکیل کو تعذیب کہتے ہیں۔

اگرچہ حضرت موسیٰ نے ہر ممکن طریق سے فرعون کو راہ رست پر لانے کی کوشش کی، اور ہر قسم کے دلائل اس کے سامنے پیش کیے، مگر وہ برابر ان تمام باتوں کا انکار ہی کرتا رہا، بلکہ ان معجزات قاہرہ کو دیکھنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، موسیٰ کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔

اس نے تمام اطراف مملکت سے عظیم الشان لشکر جمع کیا، اور انا ربکم الاعلیٰ کا ڈنکا بجا دیا۔ بے شک موسیٰ ایک عاجز و درماندہ انسان تھے، ان کے پاس کوئی مسلح فوج نہ تھی جو اس کا مقابلہ کرتی، فرعون کا لشکر ہر قسم کے آلات حرب سے آراستہ تھا، اور تمام ملک کا خزانہ اس کی امداد پر، مگر دیکھو اس کا انجام کیا ہوا، اس کی اتنی بڑی سلطنت کہاں گئی: فاخرجنٰھم من جنٰت وعیون وکنوز ومقام کریم، (۲۶: ۵۷ و ۵۸) تو ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے نکال دیا، اور خزانوں اور نفیس مکانات سے، اس قصہ کی مزید تفصیل اور اس کے دلچسپ نتائج و عبر ہماری کتاب "بصائر" میں ملاحظہ کیجئے۔

اب غور کرو، کیا حکم خداوندی کے اجرا میں اس کی اتنی بڑی سلطنت کوئی رکاوٹ پیدا کر سکی

کیا اس کے لشکر نے کچھ مدد کی، ہرگز نہیں فرعون کا یہ واقعہ عبرتوں اور بصیرتوں کے صدہا خزانے اپنے اندر مخفی رکھتا ہے، پس وہ لوگ جو قیامت کو ناممکن خیال کرتے ہیں وہ دیکھ لیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون جیسے جبار بادشاہ کو آن واحد میں نیست و نابود کر دیا، اسی طرح وہ تمام کائنات ارضی و سماوی کو بھی ایک ہی لمحہ میں فنا کر سکتا ہے۔

(۲۷) ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا	لوگو! بھلا تمہارا پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کا بنانا کہ اس کو
(۲۸) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا (۲۹) وَاَغْطَشَ	خدا نے بنایا، اس کی چھت کو اونچا کیا، پھر اس کو ہموار
لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا (۳۰) وَالْاَرْضَ بَعْدَ	کیا، اور اس کی رات کو تاریک بنایا، اور اس کی دھوپ
ذٰلِكَ دَحٰىهَا (۳۱) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا	نکالی اور اس کے علاوہ زمین کو بچھایا، اسی میں سے اس کا
وَمَرْعٰىهَا (۳۲) وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا (۳۳)	پانی اور اس کا چارہ نکالا، اور پہاڑوں کو اس میں گاڑ کر
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ۔	ہلا دیا، یہ سب تمہارے اور تمہارے چارپایوں کے فائدے کے لیے

سمکھا کسی چیز کی بلندی جب نیچے کی جانب سے اوپر کی طرف تک لی جائے، اغطش اس کے لغوی معنی اندھیرے کے ہیں، یہ لازم و متعدی دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، دحھا دحو کہتے ہیں بچھانے کو، مرعٰھا، چراگاہ۔

جو لوگ قیامت کو ناممکن الوقوع خیال کرتے ہیں، وہ ذرا اس بات میں تو غور کریں کہ کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان لوگوں کا پیدا کرنا مشکل تھا، یا اس بے ستون آسمان کا بنانا، جب اس نے یہ نیلگوں چھت بنائی، اور نہ صرف یہ بلکہ دن اور رات، زمین اور پہاڑ، پانی اور مرغزار تو اس کے لیے قیامت اور انسان کو دوبارہ زندگی بخشنا کیا مشکل ہے۔

یہ سمجھ لیجیے کہ اوپر جو کچھ مذکور ہوا ہے وہ تمام و کمال صرف انسان ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تو کیا وہ انسان جس کی خاطر جمادات، نباتات، حیوانات اور کواکب سیارات پیدا کیے گئے مرنے کے بعد

بالکل فنا ہو جائے گا، اور سب کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا، یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام کارخانہ لغو و مہمل ہو، ضرور ایک نہ ایک دن اس نظام کو توڑ دیا جائے گا، اور اس روز انسان سے اس کے اعمال کی باز پرس ہوگی۔

نتائج اعمال

(۳۴) فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ	تو جب بڑی آفت آئے گی، اس دن انسان اپنے کاموں
(۳۵) يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ (۳۶)	کو یاد کرے گا، اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے نکال کر
وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ (۳۷) فَأَمَّا	رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی، اور دنیا کی زندگی
مَن طَغَىٰ (۳۸) وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا	کو مقدم سمجھا، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور جو اپنے پروردگار
(۳۹) فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (۴۰) وَ	کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا، اور جی کو خواہشوں
أَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ	سے روکتا رہا، اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔
عَنِ الْهَوَىٰ (۴۱) فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ۔	

الطامہ کہتے ہیں بڑی مصیبت و آفت کو جو کسی طرح نہ ٹل سکے، اور سب پر غالب آجائے:

والساعۃ ادھی وامر (۵۴ : ۴۶)

ان شواہد و بینات کے بعد انسان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ حادثہ کبریٰ اور یہ مصیبت عظمیٰ یقینی اور قطعی ہے، اور اس سے کسی طرح بھی بچاؤ ممکن نہیں، جب یہ انقلاب عظیم رونما ہوگا، تو ہر انسان کو اپنے تمام وہ اعمال یاد آجائیں گے جو اس نے اپنی زندگی میں کیے تھے، مگر امتداد زمانہ کی وجہ سے بالکل بھول گیا تھا، ادھر یہ اعمال یاد آئیں گے، اور ادھر دوزخ اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی: وان منکم الا واردھا کان علی ربک حتما مقضیا، (۱۹ : ۷۱) اور تم میں کوئی نہیں مگر اسے اس پر گزرنا ہوگا، یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔

یہ وقت نتائج اعمال کا ہوگا، جن لوگوں نے اس زندگی میں طغیان و سرکشی اختیار کی، اور دنیاوی

فوائد کو آخرت پر برابر ترجیح دیتے رہے ان کا ٹھکانا دوزخ ہی لیکن جو اپنی ذمہ داری و مسئولیت کے خیال سے ورع و تقویٰ کی زندگی بسر کرتے رہے اللہ کا خوف ان کے دل پر طاری رہا، اور انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو شیطانی وساوس اور خواہشات نفسانی سے بچایا، تو وہ یقیناً جنت میں جائیں گے۔

غرض یہ کہ اس دن صرف اعمال پر فیصلہ ہوگا، کل نفس بما کسبت رہینۃ، (۳۸:۷۴) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے۔

قیامت کی تاریخ

(۴۲) یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (۴۳) فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (۴۴) اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا، (۴۵) اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (۴۶) كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا۔

لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا، سو تم اس کے ذکر سے کس فکر میں ہو اس کا منتہا یعنی واقع ہونیکا وقت تمہارے پروردگار ہی کو معلوم ہی، جو شخص قیامت سے ڈرنا چاہتا ہی، تم اس کو آگاہ کرنے والے ہو، اور بس لوگ جب دن قیامت کو دیکھیں گے، تو اُن کو ایسا معلوم ہوگا، کہ گویا وہ دنیا میں دن کے آخر پہر ٹھہرے یا اول پہر۔

ان کفار و معاندین کو چاہیئے تو یہ تھا کہ جب قیامت کے یہ ہولناک واقعات و حوادث سُنے تھے تو اس سے عبرت پکڑتے، اپنی اصلاح کرتے، اور اپنی ذمہ داری و مسئولیت کا خیال کرکے اعمال فاسقہ سے مجتنب رہتے، مگر ان کے تمرد و طغیان کی حالت یہ ہی کہ اب آپ سے اس کی تاریخ وقوع پوچھتے ہیں، ظاہر ہی کہ اگر آج کسی شخص کو اپنے مرنے کی تاریخ معلوم ہو جائے تو اس کے تمام کاروبار زندگی میں اسی وقت ایک انقلاب عظیم رونما ہوگا، اور پھر وہ کم از کم اس دنیا کے کام کا نہ رہے گا، اسی پر آپ قیامت کو قیاس کر لیجئے، اس نظام عالم کو قائم رکھنے کے لیئے یہ ضروری ہی کہ اس کی تاریخ کسی کو معلوم نہ ہو، اور تو اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا علم نہیں حالانکہ تمام انبیاء کرام سے زیادہ آپنے

اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

حضرت جبرئیل نے آپ سے اس کی تاریخ کا سوال کیا، تو آپ نے فرمایا: ما المسئول عنها باعلم من السائل، اس میدان میں ہم دونوں برابر ہیں، اسی لیے سورۂ اعراف میں آتا ہے: یسئلونک عن الساعۃ ایان مرسٰھا، قل انما علمها عند ربی، لایجلیھا لوقتھا الا ھو، ثقلت فی السمٰوٰت والارض، لا تاتیکم الا بغتۃ، یسئلونک کانک حفی عنها، قل انما علمها عند اللہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون، (۷: ۱۸۷) اے پیغمبر لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کہیں اس کا تھل بیڑا بھی ہے، تم ان کو جواب دو کہ اس کا علم تو صرف میرے پروردگار ہی کو ہے، بس وہی اس کو اس کے وقت مقرر پر لا دکھائے گا، وہ ایک بڑا بھاری حادثہ ہے جو آسمانوں اور زمین میں واقع ہوگا، قیامت تو بس اچانک تم لوگوں کے سامنے آ موجود ہوگی، اے پیغمبر یہ لوگ تم سے قیامت کا حال اس طرح اصرار کے ساتھ دریافت کرتے ہیں کہ گویا تم اس کی ٹوہ میں لگے رہے ہو، اور تم کو اس کا وقت معلوم ہے، تو ان سے کہو کہ قیامت کا علم تو بس خدا ہی کو ہے، لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔

بعض کتابوں میں قیامت کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور بہت سے نجومی بھی اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں، مگر یہ یقین کر لینا چاہیے کہ یہ سراسر غلط ہے، اور کسی شخص کو اس کا علم نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا خدا کا محبوب ہی کیوں نہ ہو۔

دنیا کی زندگی

رسول کا فرض اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ آثار و قرائن بیان کر کے لوگوں کو اس کے لیے تیار کر دے، اور اس کے نتائج وعواقب ان کے سامنے پیش کر دے، تاریخ بتانا نہ اس کا کام ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت و بزرگی ہے۔

آج تو یہ لوگ جلدی کرتے ہیں، اس کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے ہیں لیکن جب وہ وقت آجائے گا تو

ان کو اپنی تمام زندگی اس کے سامنے بالکل بے معنی اور بے حقیقت معلوم ہوگی اور وہ ایسا خیال کریں گے کہ دنیا میں ہماری زندگی چند گھنٹوں کی تھی، تو پھر جس حیات مستعار کا یہ نتیجہ ہو اُس پر اترانے اور فخر کرنے کی کیا ضرورت ہے، سورۂ احقاف میں آتا ہے: کانہم یوم یرون ما یوعدون لم یلبثوا الا ساعۃ من نہار (۴۶: ۳۵) جس دن یہ اُس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، تو خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر دن، ایک جگہ یوں آتا ہے: لبثنا یوماً او بعض یوم (۲۳: ۱۱۳) ہم ایک روز یا ایک روز سے بھی کم رہے تھے۔



عبس

(آیات، ۴۲)

تلخیص مضامین

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کی بنا پر دنیا میں مختلف قسم کے لوگ پیدا کیے ہیں بعض امیر ہیں بعض غریب ایک ابتدا ہی میں دولتمند گھرانے میں پیدا ہوتا ہے اور دوسرا مفلس و قلاش باپ کے گھر میں اس تفریق و امتیاز کی بنا پر ارباب دولت و ثروت کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اب دنیا کے ہر کاروبار میں ان کو غربا اور مساکین کے مقابلہ میں نمایاں اور ممتاز حیثیت دی جائے، پھر ان کا یہ غرور باطل یہاں تک ترقی کرجاتا ہے کہ وہ تعلیم الٰہی کے کسب و حصول میں بھی اس فرق و امتیاز کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو انھیں معلوم ہوجائے گا کہ ان کا یہ مطالبہ قطعاً غلط اور بے بنیاد دلائل پر مبنی ہے۔

سورۂ عبس میں اسی موضوع پر بحث کی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصولاً یہ چیز غلط ہے تعلیم میں مساوات ضروری ہے، اسی لیئے ابتدائے سورۃ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، آیت ۱۱ سے بتایا ہے کہ قرآن کی تعلیم بہترین ہے، اور اس کے حامل مخصوص لوگ ہوں گے، پھر آیت ۱۷ سے اس غرور باطل کے پتلے انسان کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مختلف دوروں کا مطالعہ کرے پیدائش، موت اور اس کے درمیان کا حصہ کیا ان میں سے کسی حصہ میں بھی فقیر اور شاہ کا امتیاز کیا گیا ہے۔

آیت ۳۳ سے بتایا کہ قیامت کے روز نسل و خاندان سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، بلکہ ہر شخص اپنے کاموں کا خود ذمہ دار ہوگا، پس جب یہ غرور باطل اس روز کچھ کام نہ آئے گا تو آج خود بخود کیوں نہیں اس کو چھوڑ دیتے، آیت ۳۸ سے نتائج کی طرف توجہ دلائی، اور اسی پر سورۃ کو ختم کردیا۔

مساوات عمومی

عبداللہ بن ام مکتوم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ سب سے پہلے اپنے عزیز و قریب کو ہدایت کی طرف بلائیں: وانذر عشیرتک الاقربین؛ چنانچہ ایک روز سرداران قریش میں کا ایک سردار آپ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا، اور آپ اُس کے سامنے اسلام کی تعلیم پیش کر رہے تھے کہ اتنے میں عبداللہ بن ام مکتوم ایک نابینا صحابی آپ کے پاس آئے، ان کی والدہ ام مکتوم حضرت خدیجہ کی خالہ ہیں؛ آپ نے عبداللہ کو دیکھا تو آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ رئیس قوم محض اس وجہ سے کہیں اسلام سے برگشتہ نہ ہو جائے کہ میرے پیرو کار غریب و مفلس لوگ ہیں؛ اس خیال کا آنا تھا کہ حسب ذیل آیات نازل ہوئیں:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) عَبَسَ وَتَوَلّٰی (۲) اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی (۳) وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی (۴) اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی (۵) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی (۶) فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی (۷) وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی (۸) وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی (۹) وَھُوَ یَخْشٰی (۱۰) فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَهّٰی۔

اتنی بات پر چیں بجبیں ہوئے اور موںھ موڑ بیٹھے کہ ایک نابینا اُن کے پاس آیا، اور تم کیا جانو عجب نہیں کہ تمہاری تعلیم سے وہ سنور جائے، یا نصیحت کی باتیں سُنے اور اس کو نصیحت سود مند ہو؛ تو جو شخص بے پروائی کرتا ہے؛ اس کی طرف تو تم خوب توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ ٹھیک نہ ہو تو تم پر کچھ الزام نہیں؛ اور جو خدا سے ڈر کر تمہارے پاس دوڑتا ہوا آئے تو تم اُس سے بے اعتنائی کرتے ہو

تصدیٰ، یہ صدد سے ہی، اس کے معنی سامنے آنے اور متوجہ ہونے کے ہیں، یہ تولّی کی ضد ہے،
تلھّٰی یہ لٰھی سے لیا گیا ہی، اس کے معنی اعراض کرنے اور موںھ موڑ لینے کے ہیں۔

یہ عتاب نہیں

دنیا میں رسول اللہ کی تشریف آوری تعلیم کتاب و حکمت کے لیے تھی، اور اس لیے آپ اپنا تمام وقت لوگوں کی ہدایت و راہ نمائی میں صرف کرتے تھے، اور بعض اوقات یہ ولولہ تبلیغ اسلام اپنی انتہائی مدارج طے کر لیتا تھا، اس لیے خود لسان الٰہی کو اس سے روکنا پڑتا تھا، اس لیے کہ لبسا اوقات مومنین صالحین کی حق تلفی ہوتی تھی، اور آپ کا تمام وقت معاندین کے ساتھ صرف ہو جاتا تھا، چنانچہ ایک جگہ فرمایا: لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین، (۲۶: ۳) شاید تم اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دوگے، ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ ولا تعد عینٰک عنھم ترید زینۃ الحیٰوۃ الدنیا (۱۸: ۲۸) اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، اُن کے ساتھ صبر کیے رہو، اور تمھاری نگاہیں ان پر سے گذر کر اور طرف نہ دوڑیں کہ تم آرائش زندگانی دنیا کے خواستگار ہو جاؤ، خود حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کا واقعہ اس کا شاہد ہی کہ ایک غریب مسلمان آتا ہی، مگر آپ کی تمام تر توجہ اس شخص کی طرف رہتی ہی، جس کے دل میں اسلام کی طرف ذرّہ برابر بھی میلان نہیں پیدا ہوا۔

وحی الٰہی ہمیشہ مواقع کی منتظر رہتی ہی، چنانچہ فوراً اُس وقت آیات نازل ہوئیں، جو زیب عنوان ہیں، جو ایک طرف ان کفار و معاندین اسلام کی زجر و توبیخ اور تنبیہ و تادیب پر حاوی ہیں کہ اب انھیں قابل توجہ خیال نہیں کیا جاتا، اور دوسری جانب ان فرزندان اسلام کے لیے فرح و انبساط اور مسرت و شادمانی کا ذخیرہ ہیں جو اس میں شک نہیں کہ غریب اور مفلس ہیں، مگر دولت ایمان سے مالا مال ہیں، پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی توجہ کو ان لوگوں کی طرف پھیر دیا، جو حقیقت میں اس شفقت

و رحمت کے اہل تھے، اور فرمایا: وانذر به الذین یخافون ان یحشروا الی ربهم لیس لهم من دونه ولی ولا شفیع لعلهم یتقون، ولا تطرد الذین یدعون ربهم بالغداوة والعشی یریدون وجهه ما علیک من حسابهم من شیئ وما من حسابک علیهم من شیئ فتطردهم فتکون من الظلمین، وکذلک فتنا بعضهم ببعض لیقولوا اهولاء من الله علیهم من بیننا، الیس الله باعلم بالشکرین (۶: ۵۱ تا ۵۳) اور جو لوگ خوف رکھتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر کیے جائیں گے، اور جانتے ہیں کہ اس کے سوا نہ تو اُن کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا، اُن کو اس قرآن کے ذریعے نصیحت کرو تاکہ پرہیزگار بنیں، اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں، اور اُس کی ذات کے طالب ہیں، ان کو اپنے پاس سے مت نکالو، ان کے حساب کی جواب دہی تم پر کچھ نہیں، اور تمہارے حساب کی جواب دہی اُن پر کچھ نہیں، لیکن ایسا نہ کرنا، اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے، اور اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کی بعض سے آزمائش کی ہے کہ جو دولتمند ہیں وہ غریبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم میں سے فضل کیا ہے، بھلا خدا شکر کرنے والوں سے واقف نہیں؟

عصمت انبیائے کرام

کوئی انسان اپنی سعی و کوشش سے نبی اور رسول نہیں بن سکتا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا مخصوص فضل و احسان ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس فضیلت و برتری کے لیے چن لیتا ہے: اللہ اعلم حیث یجعل رسالته لیکن جس برگزیدہ ہستی کو وہ چن لیتا ہے، اس کے تقویٰ و طہارت اور ورع و پاکیزگی کو اس کی تمام امت بھی متفقہ طور پر نہیں پہنچ سکتی، وہ اپنے اتباع و مقلدین کے لیے نمونہ عمل اور اُسوۂ حسنہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل مخصوص سے اُس کی حفاظت کرتا ہے، اور اس کو ہر قسم کے زیغ و کج روی سے بچاتا ہے: فانک باعیننا (۵۲: ۴۸) تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو، سورۂ جن میں آتا ہے: فانه یسلک من بین یدیه ومن خلفه رصدا لیعلم ان قد ابلغوا رسلت ربهم واحاط

بمالدیہم واحصی کل شئی عددا (۷۲ : ۲۷ و ۲۸) اس کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے تاکہ معلوم فرمائے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیے ہیں، اور یوں تو اس نے ان کی سب چیزوں کو ہر طرف سے قابو کر رکھا، اور ایک ایک چیز گن رکھی ہے۔

پس اللہ تعالیٰ ہر صورت میں اپنے نبی کی حفاظت کرتا ہے، کبھی اس کو ایک جگہ رحمت کرنے سے روکتا ہے کہ وہ اس کا صحیح محل استعمال نہیں، اور کبھی اس کو صبر و استقامت کی تعلیم دیتا ہے کہ اسکی غیرت اس کا تقاضا کرتی ہے، خود اس قصہ کو دیکھیے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ آپ بیجا موقع پر اپنی رحمت و شفقت کو استعمال کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فوراً روک دیا اور صحیح جانب متوجہ کر دیا

غلط فہمی کا ازالہ

ان آیات سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا ہے کہ عبداللہ بن ام مکتوم نے آتے ہی چند سوالات کیے تھے، جن کی بنا پر آپ ناراض ہو گئے، چنانچہ بعض روایات بھی اس خیال کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں، اور اسی بنا پر امام فخرالدین رازی کو اپنی عادت کے مطابق ان امور کو تسلیم کر کے جواب دینا پڑا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ احادیث سب کی سب کمزور اور ضعیف ہیں، چنانچہ آیت وما یدریک لعلہ یزکی او یذکر فتنفعہ الذکری، ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ہرگز اطلاع نہ تھی کہ وہ اس غرض کے لیے آئے ہیں، اگر آپ کو معلوم ہوتا تو آپ یقیناً ان کی طرف متوجہ ہوتے۔

اس کے سوا ان آیات کا اور کوئی مطلب نہیں کہ ان کا آنا ہی آپ کو ناگوار گذرا تا کہ رؤساء قوم یہ نہ کہیں کہ ادنیٰ درجہ کے لوگ اس رسول کا اتباع کرتے ہیں، اور اس لیے اسلام سے رک جائیں، چنانچہ مجاہد کی بھی یہی رائے ہے۔

خصوصیات قرآن

(۱۱) کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَةٌ (۱۲) فَمَنْ شَآءَ   سنو جی! قرآن تو سرتاسر نصیحت ہے پس جو چاہے اس کو

ذِكْرَهٗ (١٣) فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ (١٤) مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (١٥) بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ (١٦) كِرَامٍ بَرَرَةٍ

سوچے اور ہمارے ہاں وہ لوح محفوظ کے اوراق میں لکھا ہوا ہے جن کی تعظیم کی جاتی ہے اور وہ اونچی جگہ رکھے ہوئے ہیں اور پاک ہیں اور ایسے لکھنے والوں کے ہاتھو ں میں رہتے ہیں جو بزرگ اور نیکوکار ہیں۔

سفرہ جمع ہے سافر کی، لکھنے والے کو کہتے ہیں اس کے لغوی معنی ظاہر کرنے کے ہیں، لکھنے والا بھی اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے، اس لیے اس کو سافر کہتے ہیں، بررہ جمع ہے بار کی اس کے معنی فرماں بردار کے ہیں۔

گذشتہ آیات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوۃ وارشاد میں غلو سے کام لے رہے تھے اور ہر قسم کی تکلیف ومصیبت برداشت کرتے تھے، اس لئے آپ کو بتایا گیا کہ آپ پریشان خاطر نہ ہوں اگر آپ کی سعی وکوشش کے باوجود یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لست علیھم بمصیطر (۸۸ : ۲۲) تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔

اب ان آیات میں قرآن کریم کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ جو تعلیم آپ کو دی گئی ہے، جلالت قدر میں دنیا کی کوئی تعلیم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ قرآن یکسر تذکیر وموعظت اور پند ونصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے عبرت اندوز وبصیرت افروز ہو، آپ کو اپنے علو مرتبت سے نیچے اترنے اور الحاح وتضرع کی ضرورت نہیں، ملاء اعلیٰ میں یہ کتاب عزیز نہایت ہی بلند اور عالیشان اوراق میں لکھی ہوئی ہے: وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم (۴۳ : ۴) اور یہ بڑی کتاب یعنی لوح محفوظ میں ہمارے پاس لکھی ہوئی اور بڑی فضیلت اور حکمت والی ہے۔

اس کی پاکی اور تطہیر کی کیفیت یہ ہے کہ وہاں تک کسی خبیث کی رسائی نہیں ہو سکتی: فی کتب مکنون لا یمسہ الا المطھرون (۵۶ : ۷۹) اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں، دوسری جگہ

فرمایا: بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ (۸۵: ۲۱ و ۲۲)، بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے، لوح محفوظ میں لکھا ہوا۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: وانہ لکتب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (۴۱: ۴۱ و ۴۲) اور یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے، اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے دانا اور خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔

جن فرشتوں کی معرفت اس قرآن کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا جاتا ہے، ان کی طہارت و پاکیزگی، ورع و تقویٰ اور قدر و منزلت میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا: انہ لقول رسول کریم، ذی قوۃ عند ذی العرش مکین، مطاع ثم امین، (۸۱: ۱۹ تا ۲۱) بے شک یہ قرآن فرشتۂ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے، جو صاحب قوت مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا سردار اور امانت دار ہے۔

اعتبار

پس جس قرآن کی یہ صفات و مختصات ہوں اس کے لیے اصرار و الحاح کی ضرورت نہیں، بلکہ آپ ان معاندین کی پروا تک نہ کیجیے، جس کا جی چاہے ایمان لے آئے، خواہ انکار کردے: فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔

قرآن کی جو صفات اوپر بیان کی گئی ہیں ان سے لطیف طور پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں بھی وہی لوگ اس کے حامل اور پیغامبر ہوں گے جن میں یہ صفات ممتاز اور نمایاں ہوں گی، چنانچہ صحابہ کرام کی جو جماعت رسول اللہ کی صحبت سے تیار ہوئی، اُن کے فضائل و کمالات کو دیکھیے تو ان آیات کا ایک ایک حرف ان پر صادق آئے گا: فبھداہم اقتدہ، تمہیں چاہیے کہ تم لوگ بھی اسی رسول اور اس کے اصحاب کی پیروی کرو تاکہ تم میں وہی مخصوصات و نما ہوں۔

انسان کی ناشکر گذاری۔

(۱۷) قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۸) مِنْ	آدمی پر خدا کی مار وہ کس قدر ناشکر گذار ہے، خدا نے
اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۱۹) مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ	اس کو کس چیز سے پیدا کیا، نطفہ سے پہلے اس کو بنایا
فَقَدَّرَهٗ (۲۰) ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (۲۱) ثُمَّ	پھر اس کی ہر ایک چیز کا اندازہ باندھ دیا، پھر نیکی اور بدی
اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۲۲) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ	کا رستہ اس پر آسان کر دیا، پھر اس کو مار دیا، پھر اس کو قبر
(۲۳) كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ (۲۴) فَلْيَنْظُرِ	میں لیجا داخل کیا، پھر جب چاہے گا اس کو دوبارہ اٹھا
الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۲۵) اَنَّا صَبَبْنَا	کھڑا کرے گا، حق تو یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ آدمی کو حکم دیا اس نے
الْمَآءَ صَبًّا (۲۶) ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا	اس کی تعمیل ہی نہیں کی، تو آدمی کو چاہیئے کہ اپنے کھانے
(۲۷) فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا (۲۸) وَّعِنَبًا وَّ	کی طرف توجہ کرے کہ ہم نے اوپر سے پانی برسایا، پھر
قَضْبًا (۲۹) وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا (۳۰) وَّ	ہم نے زمین کو پھاڑا، پھر ہم نے زمین میں یہ سب کچھ اُگایا
حَدَآئِقَ غُلْبًا (۳۱) وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا (۳۲)	یعنی غلہ اور انگور اور ترکاریاں و زیتون، اور کھجوریں اور
مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ۔	گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارا، یہ سب اس لیے کہ تم
	لوگوں کو اور تمہارے چارپایوں کو فائدہ پہونچے۔

قضبا، ترکاری، اس کے لغوی معنی کاٹنے کے ہیں، ترکاری بھی برابر کاٹی جاتی ہے اس لیے اس کو قضب کہتے ہیں، غلبا، جمع ہے اغلب کی، وہ درخت جس کی شاخیں دوسرے سے لپٹی ہوئی ہوں، ابا چارہ۔

اللہ تعالیٰ نے تو فرزند آدم کی فلاح و کامرانی کے لیے انبیاء و رسل کا سلسلہ قائم کیا، اور ان کی معرفت اپنی تعلیم نازل کی، مگر یہ اپنی دولت و ثروت پر نازاں ہیں، اپنی نسل کا انھیں غرور ہے، اور اپنے آپ کو عام لوگوں سے ممتاز اور نمایاں خیال کرتے ہیں، اس لیے ان کی خواہش یہ ہے کہ ہمیں فقرا اور مساکین سے الگ کر کے تعلیم دی جائے، اور یہ صرف اسی لیے قرآن کی تعلیم سے گریز کرتے ہیں کہ اس کی

عمل کرنے والے دنیاوی لحاظ سے معمولی ہیں، انومن کما امن السفہاء (۲ : ۱۳) کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح اور احمق ایمان لے آئے ہیں کبھی کہتے ہیں: انومن لک واتبعک الارذلون (۲۶ : ۱۱۱) کیا ہم تم کو مان لیں اور تمہارے پیرو تو رذیل لوگ ہوئے ہیں۔

ابتدا و انتہا

ان احمقوں کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کی ابتدا و انتہا میں غور کریں کیا ان کی پیدایش ایک غریب کے مقابلہ میں کسی بہتر طریق سے ہوئی ہے، وہی منی کا قطرہ ہے جس سے امیر اور غریب کی تخلیق عمل میں آئی ہے، پھر موت اور عالم برزخ دونوں کے لیے برابر ہے سب کو خدا نے نیکی اور بدی کا رستہ بتا دیا ہے، اور کسی قسم کی تفریق نہیں کی۔

درمیانی زندگی۔

اب تم زندگی کے درمیانی مراحل کو دیکھو، آسمان سے پانی سب کے لئے برابر نازل ہوتا ہے زمین سے ہر قسم کی سبزی تمام کے واسطے نکلتی ہے اس میں نہ صرف امیر و غریب شریک ہیں بلکہ ان کے چارپائے بھی حصہ دار ہیں۔

انسان اس قدر عاجز و درماندہ ہے کہ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی بخشش وجود کا رہین منت ہے اس قدر حقیر و ذلیل ہے کہ ناپاک قطرۂ منی سے بنایا گیا ہے، اپنی زندگی کی ہر گھڑی کو قائم رکھنے کے لیئے وہ یکسر محتاج و دست نگر ہے، اس عجز و درماندگی میں ایک فقیر اور بادشاہ، غلام اور آقا، عورت اور مرد ایک ہی سطح پر ہیں پھر یہ اس کی کس قدر بدبختی ہے کہ قدرت تو اس کو کہیں بھی ایک دوسرے سے ممتاز نہیں کرتی مگر وہ خواہ مخواہ غریب اور امیر میں فرق و امتیاز کی دیوار حائل کرنا چاہتا ہے۔

اسلام کی خصوصیت کبریٰ

دنیا میں اسلام آیا کہ تمام قومی و نسلی امتیازات مٹا کر ہمیشہ کے لیئے صرف انسانیت کی بے قید

دعام عظمت کو قائم کردے اور عمل کے قانون الٰہی کا آخری اعلان کر دے، اسلام سے قبل سرزمین عرب میں قوم ونسب کے غرور واستکبار کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں کا ایک شتربان اپنے شرف ومجد خاندانی کے سامنے قیصر وکسریٰ کو بھی حقیر وذلیل خیال کرتا تھا، اور یہ صرف عرب ہی کی حالت نہ تھی تمام دنیا اس میں مبتلا تھی، اور ہر طرح کے قومی ووطنی امتیازات کے بتوں کی پرستش میں مصروف تھی، اسلام نے اپنی دعوت کی سب سے اولین کاری ضرب اسی غرور نسل وقوم کے بت پر لگائی اور اللہ کے اس قانون فطرت کی عام منادی کردی کہ: یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ، وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (۴۹: ۱۴) ہر طرح کی فضیلت وبزرگی کی بنیاد صرف عمل ہے، اور کوئی شے نہیں، قوموں اور خاندانوں کی تفریق صرف اس لیے ہے کہ باہم پہچان ہو اور تمیز کا ذریعہ ہو، اس لیے نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلائے، سب سے بڑا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تقریر میں فرمایا: یا ایہا الناس ان اللہ قد اذہب عنکم عبیۃ الجاہلیۃ وتعاظمہا بآبائہا فالناس رجل برتقی علی اللہ، وفاجر شقی ہین علی اللہ، والناس بنو آدم، وخلق اللہ آدم من التراب! لوگو! اللہ نے تم کو جاہلیت کے فخر وغرور اور خاندانی تکبر ونخوت سے پاک کر دیا ہے، انسان دو ہی قسم کے ہیں، شریف ومتقی جو اللہ کے نزدیک محترم ہے اور دوسرا فاجر بدبخت جو بدترین خلائق ہے، سب کے سب آدم کی اولاد ہیں، اور آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا تھا، اسی طرح کبھی آپ نے یہ فرمایا: لیس منا من دعی الی عصبیۃ جس نے قومیت کی طرف لوگوں کو بلایا، وہ ہم میں سے نہیں ہے، ایک مرتبہ آپ نے کہا: لیس منا من قاتل علی عصبیۃ جو شخص قوم کی حمیت میں جنگ کرے گا، اس کا ملت اسلام سے کوئی تعلق نہیں، لیس منا من مات علی عصبیۃ جو غرور قومی میں مر گیا وہ ہماری جماعت سے خارج ہو گیا۔

آپ نے حجۃ الوداع کے روز جو آخری پیغام اپنی اُمت کو دیا، اس میں اولین چیز یہی تھی کہ آپ نے نوعِ انسانی کی مساوات عمومی کا اعلان کیا: لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی، کلکم ابناء آدم ' عربی اور عجمی کو ایک دوسرے پر کوئی بزرگی حاصل نہیں، تم سب کے سب ایک آدم کی اولاد ہو۔ یہ بھی فرمایا: لیس لاحد فضل علی احد الا بدین وتقویٰ، الناس کلھم بنو آدم وآدم من تراب' کسی شخص کو دین اور تقویٰ کے بغیر دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں، تم سب اولادِ آدم ہو، اور وہ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ اس سے بڑھ کر اسلامی مساوات کا اور کیا ثبوت مل سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: لوکان زید حیا، ما استخلف رسول اللہ غیرہ، اگر آنحضرتؐ کے غلام زید زندہ ہوتے تو آپ ان کے سوا اور کسی کو اپنا جانشین نہ بناتے'

غرورِ نسل بے کار ہے

(۳۳) فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ (۳۴) یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ (۳۵) وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ (۳۶) وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ (۳۷) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ

تو جب قیامت کا غل مچیگا، اُس دن آدمی اپنے بھائی سے دُور بھاگے گا، اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔ ہر شخص اُس روز ایک فکر میں ہوگا جو اُسے مصروفیت کے لیے بس کرے گا۔

اگر خاندان و قومیت کا غرور و تکبر چھوڑ دو تو بہتر ورنہ یاد رہے' ایک وقت یقیناً آنے والا ہے جب تمہیں ان امتیازات رنگ و نسل کو خود بخود خیرباد کہنا پڑے گا۔ اس روز حالت یہ ہوگی کہ سب کے سب نفسی نفسی پکاریں گے، ہر ایک کو اپنی اپنی نجات کی فکر ہوگی، آدمی اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی اس خوف کے مارے بھاگے گا کہ ان کے اعمال فاسقہ کی بازپرس کہیں اس سے نہ ہو جائے، وہ خود فکر و تنگدستی میں اس قدر منہمک ہوگا کہ خاندانی تعلقات سب بھول جائیں گے۔

پس جب اس روز تم ان قومی اور وطنی روابط کو جبراً واکراہاً ترک کر دو گے تو آج خود بخود کیوں اس فخر سے دست بردار نہیں ہو جاتے۔

عمل کی قاہرانہ قوت

(۳۸) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (۳۹) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (۴۰) وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (۴۱) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (۴۲) أُولٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ۔

کتنے لوگوں کے مونھ اُس دن چمکتے ہوں گے ہشاش بشاش اور کتنے لوگوں کے مونھ اُس دن ایسے ہوں گے کہ ان پر گرد پڑی ہوگی، اور گرد کے علاوہ ان پر کلونس بھی چھارہی ہوگی یہی لوگ ہیں جو دنیا میں کافر اور بدکار تھے

ان آیات میں پھر اسی قانون حقیقت اور سنۃ اللہ کو بیان کیا جاتا ہے، جس کی ہمہ گیری کائنات ارضی وسماوی کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ علم وعمل کی قاہرانہ قوت ہے، دنیا وآخرت کی فلاح وکامرانی ان ہی دو چیزوں پر موقوف ہے، چنانچہ قیامت کے روز یہی فطرۃ اللہ اپنا ظہور دکھائیگی، جن لوگوں نے علوم الٰہیہ کو اخذ کرکے اپنے اخلاق درست کرلیے، وہ مسرور وشاداں نظر آئیں گے، اور جن بدبختانِ ملت نے اپنے فطری جذبہ کو فنا کردیا، تزکیہ نفس کی طرف توجہ نہ کی، وہ ناکام وخاسر رہیں گے، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آیات الٰہیہ کا انکار کیا، اور ہمیشہ احکام خداوندی کی نافرمانی کی، پھر بھلا انھیں کامیابی ہو تو کیونکر۔

التکویر

(آیات، ۲۹)

تلخیص مضامین

سورۂ عبس کے شروع میں فرمایا تھا: کلا انہا تذکرۃ، فمن شاء ذکرہ، فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطہرۃ بایدی سفرۃ کرام بررۃ، ان صفات و مخصوصات قرآن کو سن لینے کے بعد یقیناً مخالفین کی توجہ اس کتاب عزیز کی طرف ہوگی، اور یقین اس میں درس و نظر کا موقع ملے گا، اس میں غور و فکر کرنے کے وقت ضرور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا، کہ یہ تعلیم کہاں سے آتی ہے، یہ شخص جو اس قرآن کو پیش کر رہا ہے، کہیں مجنون و پاگل تو نہیں، چنانچہ وہ اس قسم کے الفاظ رسول اللہ کی شان میں کہا بھی کرتے تھے، اس لیے سورۂ تکویر میں ان کے اس سوال کا جواب دیا گیا، اور ان کو اس نظام کی طرف توجہ دلا دی گئی، جہاں سے اس کا فیضان ہوتا ہے۔

اصل مضمون شروع کرنے سے قبل حادثہ قیامت کے مختلف اثرات و نتائج بیان کئے اور فرمایا: علمت نفس ما احضرت، جب حالت یہ ہے کہ انسانی اعمال اس روز ہر شخص کے سامنے پیش کئے جائیں گے، تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان منکرین قیامت کو قرآن کریم کی طرف متوجہ کر دیا جائے، اور یہ واضح کر دیا جائے کہ ان علوم کا اصلی مرکز کونسا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس نظام کو بیان کیا، مگر اس کی تقسیم کر دی، ایک تو دن اور رات کو شامل ہے جس میں کسی کو شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں، اسی طرح اگر وہ اس نبی امی کے حالات کا درس و مطالعہ کریں گے،

تو کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے گی۔

لیکن اس کے علاوہ نجوم و کوکب میں خمسہ متحیرہ ہیں، جن کی حقیقت سوائے مخصوص اربابِ ہیئت و نجوم کے اور کوئی نہیں جانتا، مگر کسی کو ان سے انکار کی گنجائش بھی نہیں، پس اسی پر تم وحی و الہام کے نظام کو قیاس کر لو، البتہ یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جو فرشتہ اس پیغام کو لاتا ہے وہ معزز و محترم اور دیانتدار ہے، اور وہ اگرچہ تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہے مگر ہمارے بندہ محمد نے اس کو اصلی شکل و صورت میں بھی کئی مرتبہ دیکھا ہے۔

آگے چل کر نبی کریم کی خصوصیات بیان کیں، کہ اربابِ فلسفہ کی طرح وہ بخیل نہیں بلکہ انھیں ہمیشہ یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح قرآن تمھیں سنا دیں، اور یہ بھی تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ جس شخص نے اس کتاب کریم کی پیروی کی ہے، وہ اعمال و اخلاق میں بہت زیادہ مہذب و شائستہ بن گیا ہے، اگر یہ علوم شیطان کی طرف سے ہوتے تو یہ اخلاقی ارتقا ناممکن تھا، جب یہ عمدہ ترین نتائج تمہارے سامنے ہیں تو پھر تم کیوں نہیں اس کے آگے خمیدہ گردن ہو جاتے، یہ تو ایک عالم گیر قانونِ اخلاق و ارتقا ہے، کسی قوم، ملک، رنگ اور نسل کی اس میں خصوصیت نہیں، اب جس کا جی چاہے اس کو مان لے۔

وحی والہام

واقعات قیامت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) اِذَا الشَّمْسُ
کُوِّرَتْ (۲) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ (۳)
وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ (۴) وَاِذَا الْعِشَارُ
عُطِّلَتْ (۵) وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ
(۶) وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۷) وَاِذَا النُّفُوْسُ
زُوِّجَتْ (۸) وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ (۹)
بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۱۰) وَاِذَا الصُّحُفُ
نُشِرَتْ (۱۱) وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتْ (۱۲)
وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ (۱۳) وَاِذَا الْجَنَّۃُ
اُزْلِفَتْ (۱۴) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ۔

جب سورج لپیٹ لیا جائے گا، اور جب تارے بے نور ہو جائینگے،
اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، اور جب دس مہینے کی
گیابھن اونٹنیاں بے کار ہو جائیں گی، اور جب وحشی جانور
جمع کیے جائیں گے، اور جب دریا آگ ہو جائیں گے، اور جب
روحیں بدنوں سے ملا دی جائیں گی، اور جب اس لڑکی
سے جو زندہ دفنا دی گئی ہو پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ
پر ماری گئی، اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے،
اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی، اور جب دوزخ
کی آگ بھڑکائی جائے گی، اور جب بہشت قریب لائی جائیگی
ہر شخص معلوم کرلے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

عشار جمع ہے عشراء کی اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل پر دس مہینے گذر گئے ہوں، یہ اونٹنی عرب کے نزدیک بہت زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے، عطلت کے معنی ہیں بے کار چھوڑ دینے کے، وحوش

جمع ہی وحشی کی، اس جنگلی جانور کو کہتے ہیں جو آدمیوں سے مانوس نہ ہو، حشرت کے معنی جمع کرنے کے ہیں، زوجت لیا گیا ہی تزویج سے اور اس کے معنی ایک چیز کو دوسری سے ملانے کے ہیں، موؤدۃ واحد مؤنث مفعول کا صیغہ ہی، واد یئد سے اور واد زندہ درگور کرنے کو کہتے ہیں، کشطت، کھولنا جب ذبیحہ کی کھال اُتار کر گوشت کھول دیا جاتا ہی تو اُسے کشطت الذبیحہ کہتے ہیں۔

انسان روح اور جسم سے ترکیب دیا گیا ہی، مگر وہ عموماً اپنے جسم کی حفاظت میں روح کو فراموش کر دیتا ہی، اور فضائل اخلاق و محاسن عادات کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہی، لیکن ایک دن ایسا بھی آنے والا ہی جس دن فوز و کامرانی صرف اُس شخص کے لیے مخصوص ہوگی جو قلب سلیم اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا، ان آیات میں اس دن کی بعض خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

آج لوگ سورج کی پرستش کرتے ہیں: یسجدون للشمس من دون اللہ، مگر اس روز نہ صرف یہ بے نور ہوگا بلکہ تمام نجوم و کواکب بھی تاریک ہو جائیں گے، انسان اپنی عزیز ترین اشیاء سے فائدہ اٹھانا بھول جائے گا، سب کے سب میدان حشر میں موجود ہوں گے: وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم، ما فرطنا فی الکتب من شیء ثم الی ربہم یحشرون (۶: ۳۸) اور زمین پیا جو چلنے پھرنے والا حیوان یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہو ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں، ہم نے کتاب یعنی لوح محفوظ میں کسی چیز کے لکھنے میں کوتاہی نہیں کی، پھر سب اپنے پروردگار کی طرف جمع کیے جائیں گے۔

ان حوادث کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ارواح و اجسام کا باہمی اختلاط و امتزاج ہوگا، اور اس لڑکی کو بھی زندگی بخشی جائے گی جسے صرف اس لیے زندہ دفن کر دیا گیا تھا کہ خرچ کی کفالت نہ کیا جانا دی کے ننگ و عار سے بچا جا سکے؛ ولا تقتلوا اولادکم من املاق (۶: ۱۵۱) اور ناداری کے اندیشہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔

زمین جسمانیات کا مرکز ہے، اور آسمان روحانی ضروریات کا مخزن، جسمانیات کی جس جگہ انتہا ہوتی ہے وہاں سے روحانیات کی ابتدا ہے، جس روز یہ بیچ کا حجاب بھی اٹھا دیا جائیگا تو روحانیت بالکل سامنے آجائے گی، اسی طرح دوسرے واقعات پیش آئیں گے، اس دن ہر شخص اپنے تمام اعمال ان آنکھوں سے دیکھ لے گا، : یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا، وما عملت من سوء، (۳ : ۳۰) جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی نیکی کو موجود پائے گا، اور اُن کی بُرائی کو بھی دیکھ لے گا، ایک جگہ فرمایا : ینبأ الانسان یومئذ بما قدم واخر، (۷۵ : ۱۳) اس دن انسان کو جو عمل اس نے آگے بھیجے، اور جو پیچھے چھوڑے ہوں گے سب بتا دیے جائیں گے، کفار پکار اٹھیں گے : مالھذا الکتاب لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاہا، ووجدوا ما عملوا حاضرا، (۱۸ : ۴۹) یہ کیسی کتاب ہی کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہی نہ بڑی کو، کوئی بات بھی نہیں مگر اسے لکھ رکھا ہی، اور جو عمل کیے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے۔

خمسۂ متحیرہ

اب بتایا جاتا ہے کہ قرآن کی تعلیم کہاں سے نازل ہوتی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس نظام سے کیا تعلق ہی :

(۱۵) فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ (۱۶) الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ (۱۷) وَالَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ (۱۸) وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔

ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں، اور جو سیر کرتے اور غائب ہو جاتے ہیں، اور رات کی قسم جب ختم ہونے لگتی ہی، اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہی،

خنس جمع ہے خانس کی، اور خنوس سے لیا گیا ہی، اس کے معنی چھپنے اور پیچھے ہٹنے کے ہیں، اور اسی لیے شیطان کو بھی خناس کہتے ہیں، کنس جمع ہے کانس کی، اور یہ کنوس سے مشتق ہی، جس کے معنی کناس میں داخل ہونے کے ہیں، اور کناس وہ جگہ ہے جہاں شب کے وقت جانور

رہتے ہیں عسعس اضداد میں سے ہے، اور اس کے معنی اقبال و ادبار دونوں کے آتے ہیں۔

ان آیات میں دو چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

(الف) تم نے آسمان پر بارہا پانچ ستاروں کو دیکھا ہے، جو ایک رفتار پر کبھی قائم نہیں رہتے، صرف بڑے بڑے نجومی اور ہیئت دان ہی ان کی نقل و حرکت، اور طلوع و غروب کے لیے قانون معین کر سکتے ہیں، مگر باوجود اس کے آج تک کسی نے ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا، ان ستاروں کے نام زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، اور عطارد ہیں۔

(ب) شب کو تاریکی تمام عالم پر چھا جاتی ہے، پھر مشرق کی جانب سے ایک روشنی نمودار ہوتی ہے، اور آن واحد میں تمام عالم بقعۂ نور بن جاتا ہے، افریقہ کا وحشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ اس دل فریب نظارہ کو روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ بن کر اس کے سامنے آتی ہے کہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی شک نہیں ہوتا۔

تطابق اقسام

(۱۹) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۲۰) ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (۲۱) مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (۲۲) وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (۲۳) وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ۔

کہ بے شک یہ قرآن فرشتۂ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے، جو صاحب قوۃ مالک عرش کے ہاں اونچے درجہ والا سردار، اور امانت دار ہے، اور مکے والو تمہارے رفیق یعنی محمدؐ دیوانے نہیں ہیں، بیشک انہوں نے اس فرشتے کو آسمان کے کھلے یعنی مشرقی کنارہ پر دیکھا ہے۔

کون و مکان کے جو سلاسل مختلفہ تمہارے سامنے ہیں ان سے بالاتر ایک اور نظام بھی ہے مگر وہاں تک تمہاری عقل کی رسائی غیر ممکن ہے، جو چیزیں بظاہر تمہیں غیر منتظم دکھائی دیتی ہیں وہ اس بالاتر نظام میں نہایت ہی مربوط اور مرتب ہوتی ہیں، اس بلند و رفیع نظام کے جس قدر

معاملات ہیں، وہ جبریلؑ کی معرفت رسول اللہؐ پر القا ہوتے ہیں۔

عرش عظیم تمام روحانیات و مادیات کا مرکز حقیقی ہے، کائنات ارضی و سماوی کے متعلق ہر قسم کا حکم اسی جگہ سے نازل ہوتا ہے، اور اس سے جبریلؑ کا تعلق نہایت محکم اور مضبوط ہے پھر یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کا مرتبہ بہت بلند ہے، اس فرشتہ کے اثر کو کوئی چیز نہیں روک سکتی، اس کو جو حکم اُس عالم روحانیت سے ملتا ہے، وہ اسے بے کم و کاست رسول تک پہنچا دیتا ہے، اور اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا، گویا دوسرے الفاظ میں ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح قرآن ہماری روحانی ترقی کا ذمہ دار ہے، ویسے ہی مادی نشوو ارتقا بھی اسی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے،

یہ وہ نظام ہے، جہاں سے قرآن نازل ہوتا ہے، اس کا فہم و ادراک عام عقلوں سے بالاتر ہے، خمسۂ متحیرہ کا سلسلہ تمہارے سامنے ہے، اسی پر اس کو بھی قیاس کر لو۔

اب اسی قسم کے دوسرے حصّہ کو دیکھو، رات اور دن سے کسی شخص نے آج تک اختلاف نہیں کیا، ایسے ہی محمد بن عبداللہ کی حالت ہے: فقد لبثت فیکم عمرا افلا تعقلون (۱۰: ۱۶) میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر رہا ہوں، اور کبھی ایک کلمہ بھی اس طرح کا نہیں کہا، بھلا تم سمجھتے نہیں، تم خود اس کو صادق اور امین کے نام سے پکارتے ہو، اس کی چالیس سالہ زندگی تمہارے سامنے ہے، آج تک اس نے کبھی بھی جنون اور پاگل پن کا اظہار نہیں کیا۔

البتہ تمھیں ایک خیال پیدا ہو سکتا ہے، کہ جبریلؑ فرشتہ کا ایک انسان کے ساتھ کیا ربط و اتحاد ہو سکتا ہے، تو یہ خیال بھی بالکل بے بنیاد ہے، اس لیے کہ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے اس فرشتہ کو افق آسمان پر دیکھا ہے۔

بعض خصوصیات

(۲۴) وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (۲۵) وہ پوشیدہ باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں اور یہ
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيمٍ (۲۶) شیطان مردود کا کلام نہیں، پھر تم کدھر جا رہے ہو۔
فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ۔

اس رسول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے جو کچھ الہام ہوتا ہے، وہ اس کی اشاعت و تبلیغ میں بخل و امساک سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے دوسروں کے پاس پہنچا دے: لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم (۹ : ۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے، تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں، اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

اب اس تعلیم کو دیکھو جسے وہ پیش کرتا ہے، تو اس کا سب سے بڑا امتیازی نشان یہ ہے کہ جو لوگ اس پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں، وہ اخلاقی طور پر روز بروز ترقی کرتے جاتے ہیں، اگر اس قانون سے ترقی کی جگہ تنزل ہوتا تو اعتراض کی گنجائش بھی تھی، صحابہ کرام کے واقعات تمہارے سامنے ہیں، بھلا شیطان کو ایسی تعلیم سے کیا سروکار، اس کا تو جو قدم اٹھے گا، وہ تنزل ہی کی طرف ہوگا: انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء (۵ : ۹۱) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے۔

عالمگیر تعلیم

(۲۷) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۸) یہ تو جہان کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے، یعنی اس کے لیے
لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (۲۹) وَمَا جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے، اور تم کچھ بھی
تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے۔

قرآن کسی خاص قوم اور ملک کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ یہ ایک عالم گیر قانون اور دستورِ پند و موعظت ہی، سب قومیں اس کے آگے سرنگوں ہو کر رہیں گی، اگر تمام مذاہب و ادیان عالم کے صحائف کو جمع کر کے صرف ان مشترکہ اُصول کو لیا جاے، جو تمام نوعِ انسانی کے لیے یکساں طور پر مفید و نافع ہوں تو وہ صرف اسی قرآن میں ملیں گے، اور وہ حسبِ ذیل ہیں :۔

(الف) عبادت، ہر شخص اپنی فطرت سے اپنے خالق و مدبر کے سامنے جھکنے پر مجبول کیا گیا ہی گو یہ ممکن ہے کہ اس نے غیر خالق اور غیر مدبر کو اپنا پیدا کرنے والا اور مدبر تسلیم کر لیا ہو۔

(ب) طہارت، ہر قسم کی ظاہری و باطنی پاکیزگی ہر سلیم الطبع انسان اپنی جبلت سے پسند کرتا ہی، اور اس لیے تمام شرائع الٰہیۃ اور نوامیس فطرت نے اس پر زور دیا ہی۔

(ج) عدالت، ہر چیز کو اپنے اپنے موقع و محل پر رکھنا انسانی فطرت کی خصوصیت کبریٰ ہے، گو ذاتی اغراض اور اخلاق رذیلہ اکثر اوقات اس جذبۂ انسانیت کو مغلوب کر دیتے ہیں۔

(د) سماحت، تحمل یا بردباری، اقدام علی المہالک یا رواداری، وہ اخلاق ہیں جن پر کاربند ہوے بغیر کوئی فرد یا قوم اس دنیا میں امن چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتی، اور نہ اس دنیا میں عدالت قائم کر سکتی ہی۔

ان اصول اربعہ پر تمام دنیا متفق ہو سکتی ہی، اور قرآن سے بہتر اور کسی کتاب نے ان پر روشنی نہیں ڈالی، ان حقائق ثابتہ کے بعد جس کا جی چاہے اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالے اور اس طرح اپنی فطرت کو تباہ ہونے سے بچالے۔

الانفطار

(آیات، ۱۹)

تلخیص مضامین

اس سورۃ میں فاتحۃ الکتاب کی ایک آیت مالک یوم الدین کی تفسیر ہے، چنانچہ ابتدا میں بتایا کہ جب حادثہ قیامت برپا ہوگا، تو تمام اعمال موجود کر دیے جائیں گے، جب ایک عمل بھی ضائع نہیں جاتا تو پھر تعجب ہے کہ انسان کیوں اپنی اصلاح نہیں کرتا، حالانکہ اللہ نے انسان اور اس کی ضروریات کو پیدا کیا، اگر وہ غور کرے تو خود اس کی زندگی جزائے اعمال کی شہادت دے گی، اللہ کے فرشتے اس کی ہر نقل و حرکت کی نگرانی کرتے ہیں، پھر اس کے بعد فرمایا کہ قیامت کے روز محض اعمال پر فیصلہ ہوگا، اس روز صرف اللہ کی حکومت ہوگی اور تمام معاملات اُسی کے حضور میں پیش کیے جائیں گے۔



مالک یوم الدین

حادثۂ قیامت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ (۲) وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ (۳) وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ (۴) وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ (۵) عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ۔

جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب تارے جھڑ پڑیں گے، اور جب دریا بہ کر ایک دوسرے میں مل جائیں گے اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی تب ہر شخص معلوم کرلے گا کہ اُس نے آگے کیا بھیجا تھا، اور پیچھے کیا چھوڑا تھا۔

جب موجودہ نظام کی ضرورت نہ رہے گی اور اعلیٰ ترین قوت اس تمام نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لے گی، اس وقت آسمان فنا ہو جائے گا، ثوابت و سیارات جھڑ پڑیں گے، اور زمین میں جس قدر اجسام مدفون ہیں، ان کو بدن کا ضروری حصہ دے دیا جائے گا، اس وقت حالت یہ ہوگی کہ آج جو اُمور ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں، وہ آنکھوں کے سامنے آجائیں گے، تمام وہ اعمال جو ہم نے اپنی زندگی میں کیے تھے اور وہ صدقات جو ہمارے مرنے کے بعد بھی لوگوں کو فائدہ پہنچاتے رہے سب کے سب موجود ہوں گے۔

آخر یہ کیوں۔

(۶) یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ (۷) الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۸) فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ۔

اے انسان! تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا، وہی تو ہے جس نے تجھے بنایا، اور تیرے اعضا کو ٹھیک کیا اور تیرے قامت کو معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

تعجب یہ ہے کہ اے ظلوم وجہول انسان کس چیز نے تجھے بہکا دیا کہ وہ رب کریم جس نے یہ عظیم الشان نظام قائم کر رکھا ہے تمھیں بے کار چھوڑ دے گا: افحسبتم انما خلقنٰکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون (۲۳ : ۱۱۵) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے، اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ دوسری جگہ فرمایا: وما خلقنا السموٰت والارض وما بینهما الا بالحق وان الساعة لاٰتیة (۱۵ : ۸۵) اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو مخلوقات ان میں ہے، اس کو تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور قیامت تو ضرور آکر رہے گی۔ سورۂ قیامہ میں آتا ہے: ایحسب الانسان ان یترک سدی (۷۵ : ۳۶) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا۔

جس انسان کے یہ خیالات وافکار ہیں، اُسے چاہیے کہ اپنی خلقت پر غور کرے۔ وہی خدائے قدوس ہے جس نے اس وقت تمھیں پیدا کیا، جبکہ تمہارا نام ونشان بھی نہ تھا: ہل اتی علی الانسان حین من الدہر لم یکن شیئا مذکورا (۷۶ : ۱) بے شک انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھا، سورہ مریم میں فرمایا: یقول الانسان ءاذا ما مت لسوف اخرج حیا، اولا یذکر الانسان انا خلقنٰہ من قبل ولم یک شیئا (۱۹ : ۶۶، ۶۷) کافر انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا زندہ کر کے نکالا جاؤں گا، کیا ایسا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا، اور وہ کچھ بھی نہ تھا۔

پھر اس خدا نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے سب سے پہلے مادّے میں اجتماع وانضمام پیدا

کیا، اور اس سے تخلیق و تکوین اور وجود ہستی کے تمام مراتب ظاہر کیئے، تم میں مختلف قوتیں پیدا کیں، روحانی و جسمانی ضروریات کا انتظام کیا، خارجی اشیاء سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع دیا، اور تم میں سے ہر ایک کی استعداد و قابلیت کے مطابق اسباب و وسائل فراہم کر دیے۔

ان چیزوں کے ہوتے ہوئے تم کس غفلت میں مبتلا ہو اور کس بنا پر مجازات کا انکار کرتے ہو۔

محافظ موجود ہیں

(۹) کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ (۱۰) وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ (۱۱) کِرَامًا کَاتِبِیْنَ (۱۲) یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ۔

مگر ہیہات تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو، حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں، عالی قدر، تمہاری باتوں کے لکھنے والے، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اُسے جانتے ہیں۔

باوجود ان شواہد کے تم برابر یوم الدین کا انکار کیے جا رہے ہو، حالانکہ ہر شخص پر قدرت نے اپنے نگران کار مقرر کیے ہوئے ہیں، ہر انسان میں تین مرکز موجود ہیں:

(الف) عقل، یہ علوم و معارف اور فضل و کمال انسانی کا مرکز ہے۔

(ب) قلب، یہ تمام اخلاق و اعمال کا مرکز ہے، اسی سے ہر قسم کا داعیہ خیر و شر تولید کرتا ہے۔

(ج) نفس، اس کا فرض یہ ہے کہ بدن کی تربیت کرے اور اُس کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھے۔

دنیا میں ہر چیز اپنا مرکز رکھتی ہے، درخت اپنی جڑ سے خوراک حاصل کرتا ہے، نجوم و کواکب کو سورج سے روشنی ملتی ہے، عقاید و یقینیات کا مرکز توحید ہے، اسی طرح انسان سے جس قدر اعمال و اخلاق کا ظہور ہوتا ہے، ان میں سے ایک چیز بھی ضائع نہیں جاتی، بلکہ اپنے اپنے مرکز سے جا ملتی ہے، ان اعمال و اخلاق کا اولین اثر خود نفس انسانی پر پڑتا ہے، آیندہ وہ جو اعمال کرے گا دراصل ان ہی کاموں کے نتائج ہوں گے جو اس نے پہلے کیے تھے، جیسا کہ علم النفس میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے، اسی حقیقت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا: فاما من اعطی واتقی وصدق

بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ، و اما من بخل و استغنی و کذب بالحسنیٰ فسنیسرہ للعسریٰ (۹۲ : ۵ تا ۱۰) تو جس نے خدا کے رستے میں مال دیا اور پرہیزگاری کی اور نیک بات کو سچ جانا اُس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے، اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ بنا رہا، اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا اُسے سختی میں پہنچائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے: اسلمت علی ما اسلفت من الخیر کفر کے زمانہ کی نیکیوں کا یہ نتیجہ ہے کہ تمہیں قبول اسلام کی توفیق نصیب ہوئی۔

مگر یہ اثر اسی جگہ تک رک نہیں جاتا، بلکہ یہاں سے متجاوز ہو کر ملا، اعلیٰ پر بھی اپنا اثر ڈالتا ہے، جو اخلاق و اعمال انسانی کے لیے اصلی مرکز مقرر کیے گئے ہیں۔ ان مرکزوں تک اعمال کو پہنچانے کے لیے فطری قوتیں مصروف کار ہیں، روحانی صور و اشکال ان اخلاق کی پوری محافظ و نگران کار ہیں، اور وہ چونکہ ہر وقت ساتھ ہیں، اس لیے کوئی فعل ضائع نہیں جاتا، مرکز تو اعلیٰ ترین دفتر ہے جہاں انسانی اعمال کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور یہ کراماً کاتبین اس دفتر کے کارندے ہیں، جنھیں ایک ایک عمل معلوم ہے: ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید (۵۰ : ۱۸) کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی، مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔

ظہورِ نتائج

(۱۳) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ (۱۴) وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (۱۵) یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ (۱۶) وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ۔	بے شک نیکوکار نعمتوں کی بہشت میں ہوں گے اور بدکردار دوزخ میں، یعنی جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے اور اس سے چھپ نہیں سکیں گے۔

تمام اخلاق و اعمال تو محفوظ ہی ہیں، اس لیے نتائج کی صورت یہ ہوگی کہ جن لوگوں نے یوم الدین کے خوف سے بر و تقویٰ کی زندگی بسر کی ہوگی، وہ کامیاب ہوں گے، اور جنت میں جائیں گے مگر جن بدبختان نوع انسانی نے فسق و فجور میں دن کاٹے ہوں گے، وہ ناکام و خاسر جہنم میں

چلے جائیں گے، اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال کے نتائج سے محفوظ رہ سکے کیونکہ چھپنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

مالک یوم الدین

(۱۷) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۸) ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۹) يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَّالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۔	اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے، پھر تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے جس روز کوئی کسی کا کچھ بھلا نہ کر سکے گا، اور حکم اُس روز صرف خدا ہی کا ہوگا۔

قیامت کے روز یہ حالت ہوگی کہ کوئی شخص بھی ایک دوسرے کو نفع نہ پہنچا سکے گا، اس دن صرف اللہ کی حکومت ہوگی: لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار، دوسری جگہ آتا ہے: الملک یومئذ الحق للرحمٰن، تمام معاملات کا مرافعہ اللہ کی طرف ہوگا، درمیان میں وسائط کا سلسلہ قائم نہ رہے گا، اور خدائے جلیل وجبار خود تمام فیصلوں پر نظر ثانی کرے گا۔

التطفیف

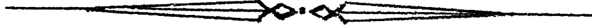
(آیات، ۳۶)

تلخیص مضامین

حدیث میں آتا ہے: لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ، تم میں سے کسی شخص کا ایمان کامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جسے وہ خود دوست رکھتا ہو۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے بھی اپنے حواریوں کو یہی نصیحت کی تھی: تو دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کر جو تو چاہتا ہو کہ دوسرے تیرے ساتھ کریں' اس سورت کا یہی موضوع ہے' اور یہ انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی سب پر حاوی ہو، اس قانون پر عمل کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کے نتائج اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔

ابتدا میں ان لوگوں کا حال ہے جو تجارت میں خود تو زیادہ وصول کر لیتے ہیں، مگر جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہو تو کم دیتے ہیں، ان کو تنبیہ کی گئی کہ اس حرکت سے باز آجائیں ورنہ اللہ کے دربار میں انھیں اپنی اس بدعملی کا جواب دینا پڑے گا، اور انجام کار جہنم میں داخل ہوں گے، اور اس ذمہ داری سے وہی شخص انکار کرسکتا ہو جو بدکرداری اور بطالت کا عادی ہو، اور جب اس کی یہ حالت ہو تو وہ اسے بھی ذہن نشین کرلے کہ قیامت کے روز شہنشاہ اعظم کے دربار میں اس کا داخلہ نہ ہوسکے گا۔

البتہ جن ارباب اخلاص و ایمان نے کسی قسم کی کمی لین دین میں نہیں کی اور ہمیشہ عدل و انصاف کو ملحوظ رکھا، وہ جنت میں جائیں گے، اگرچہ دنیا میں تطفیف کرنے والے ان متقین کے ساتھ تمسخر و استہزا کیا کرتے تھے، مگر قیامت میں معاملہ بالکل برعکس ہوگا، اور اسی پر سورت کو ختم کر دیا۔



القسطاس المستقیم

تاجروں کی مثال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ (۲) الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ (۳) وَاِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ۔

ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔

تطفیف ماپ تول میں کمی کرنے کو کہتے ہیں، اکتیال، ماپ کر لینا اور علی کے معنی من کے ہیں، ان آیات میں ان تاجروں کی حالت بیان کی گئی ہے جو خود تو خوب ٹھوک بجا کر لیتے ہیں مگر جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہے تو کم دیتے ہیں، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں یہی مرض تھا، انھوں نے فرمایا: اوفوا الکیل ولا تکونوا من المخسرین، وزنوا بالقسطاس المستقیم، ولا تبخسوا الناس اشیاءہم (۲۶: ۱۸۱ تا ۱۸۳) دیکھو پیمانہ پورا بھر کر دو، اور نقصان نہ کیا کرو، اور ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو، مگر جب وہ کسی طرح نہ مانی تو تباہ کر دی گئی قرآن نے اس کے متعلق نہایت ہی صاف و صریح احکام نافذ فرمائے ہیں، ایک جگہ آتا ہے: واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم، ذٰلک خیر و احسن تاویلا (۱۷: ۳۵) اور جب کوئی چیز ماپ کر

دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو، اور جب تولا کرو تو ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو، یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے، ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: واوفوا الکیل والمیزان بالقسط، (۶: ۱۵۲) اور ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو، سورۃ الرحمٰن میں ہے: واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان، (۵۵: ۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو، اور تول کم مت کرو۔

امثال القرآن

قرآن مجید کا عام دستور یہی ہے کہ وہ مثالوں میں قوموں کے عروج وزوال، صعود وہبوط، علو وتسفل، اور ارتقاء وتنزل کے اہمات مسائل اور اصول وکلیات بیان کرتا ہے کہ ایک عامی سے عامی آدمی بھی ان مباحث میں درخور دانی حاصل کرلے، ان آیات میں اگرچہ سوداگروں کی ایک خرابی بیان کی گئی ہے مگر دراصل ان میں ایک ایسے ہمہ گیر قانون کی تعلیم دی گئی ہے جو اجتماعی اور انفرادی طور پر زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، حکومت اگر رعایا سے اطاعت اور فرمانبرداری کی آرزومند ہے تو اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے تمام حقوق ادا کرے اور دیانت داری کے ساتھ کامل آزادی کے حصول میں اس کی معین ومددگار ہو، خاوند اپنی بیوی سے محبت وچاہت کا طلبگار رہے تو وہ بھی ان لزوجک علیک حقاً کے مطابق اُسے منزلی مراعات دینے سے گریز نہ کرے، آقا وغلام، باپ اور بیٹا، اور اسی طرح اقوام وملل سب کا فرض ہے کہ وہ اس قاعدہ کلیہ کو ہرگز نظر انداز نہ کریں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کو آویزۂ گوش بنائیں، جس کا مطلب شیخ سعدیؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ہر چہ برخود مپسندی بر دیگراں مپسند۔

تذکیر بما بعد الموت

(۴) اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ (۵) لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶) یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اٹھائے بھی جائیں گے یعنی ایک بڑے سخت دن میں جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

جو لوگ اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس بدکرداری کا ایک روز جواب دینا پڑے گا، اس دن کی ہولناکی کا نقشہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: یود المجرم لویفتدی من عذاب یومئذ ببنیہ، وصاحبتہ واخیہ وفصیلتہ التی تویہ، ومن فی الارض جمیعا، ثم ینجیہ کلا (۷۰: ۱۱ تا ۱۵) اس روز گنہگار خواہش کرے گا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں سب کچھ دیدے یعنی اپنے بیٹے، اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا اور جتنے آدمی زمین پر ہیں غرض سب کچھ دیدے اور اپنے تئیں عذاب سے چھڑالے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوگا، طبرانی میں ہے کہ جب حضرت عمر نے اس سورۃ کی تلاوت یہاں تک کی تو روتے روتے اُن کی ہچکی بندھ گئی اور آگے پڑھنے سے رُک گئے۔

آج جن حکومتوں نے ظلم وجور پر کمر باندھ رکھی ہے، اپنی رعایا کے حقوق ادا نہیں کرتیں اور اُن کی حریت وآزادی میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں، انھیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ وہ خدائے منتقم وجبار کے عذاب سے کسی طرح بچ نہیں سکتیں۔

جداگانہ نتائج

ذیل کی آیات میں بتایا جاتا ہے کہ کمی کرنے والوں کو کیا سزا ملے گی۔

(۷) کَلَّآ اِنَّ کِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ (۸) وَمَآ اَدْرٰکَ مَا سِجِّیْنٌ (۹) کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۱۰) وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ

سن رکھو کہ بدکاروں کے اعمال سجین میں ہیں، اور تم کیا جانتے ہو کہ سجین کیا چیز ہے؟ ایک دفتر ہے لکھا ہوا، اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے

(۱۱) اَلَّذِیْنَ یُکَذِّبُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ
(۱۲) وَمَا یُکَذِّبُ بِہٖٓ اِلَّا کُلُّ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ
(۱۳) اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ۔

یعنی جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں، اور اس کو جھٹلاتا وہی ہے جو حد سے نکل جانے والا گنہگار ہے جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں، تو کہتا ہے، یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

انسان جب ایک بداخلاقی کا مرتکب ہوتا ہے، اور پھر اس کو اپنی عادت بنا لیتا ہے تو انجام کار اس کے تمام اعمال پر اس کا اثر پڑتا ہے، اور روح اعظم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، اس کی تمام بداخلاقیاں ایک دفتر میں جمع ہوتی رہتی ہیں جس کا نام سجین ہے قیامت کے روز جب یہ لوگ اپنا اپنا نامۂ اعمال دیکھیں گے تو بے انتہا تکلیف محسوس کریں گے، اس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ اس ذمہ داری سے ہمارا انکار کرنا بے سود تھا، اور یاد رہے کہ اس کا وہی شخص انکار کرتا ہے جو قانون الٰہی کی پابندی سے گریز کرتا ہے، اور تعلیم الٰہی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے وہ اسے قصص و حکایات سے زیادہ وقعت نہیں دیتا، لیکن یہ لوگ انکار کرتے رہیں تو اس کی وجہ سے ایک حقیقت ثابتہ باطل نہیں ہو سکتی۔

انکار کا سبب

(۱۴) کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۱۵) کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۱۶) ثُمَّ اِنَّھُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ (۱۷) ثُمَّ یُقَالُ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ تُکَذِّبُوْنَ۔

دیکھو جو اعمال بد کرتے ہیں ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے، بے شک یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے، پھر دوزخ میں جا داخل ہوں گے، پھر ان سے کہا جائے گا، کہ یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

ان کے انکار کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے قانون فطرت کی پابندی نہیں کی اور برابر

فسق و فجور میں مبتلا رہے، کثرت معاصی نے ان کے قلوب کو زنگ آلود کر دیا، اور اب انکی عقل پر پردے پڑ گئے ہیں، لہم قلوب لا یفقہون بہا و لہم اعین لا یبصرون بہا و لہم اذان لا یسمعون بہا، اولئک کالانعام، بل ہم اضل اولئک ہم الغافلون، (۷: ۱۷۹) ان کے دل ہیں، لیکن ان سے سمجھتے نہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں، پر اُن سے سنتے نہیں، یہ لوگ بالکل چارپاؤں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، یہی وہ حالت ہے جس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا: ولیس وراء ذلک حبۃ خردل من الایمان، اسی کیفیت کو قرآن نے کفر، جحود، اور ختم سے تعبیر کیا ہے، یہی شقاوت قلب ہے، اسی پر فہی کالحجارۃ او اشد قسوۃ کا اطلاق ہوتا ہے، اور اسی کا نتیجہ انکار مسئولیت ہے۔

ایک شخص کی اعلیٰ ترین کامیابی یہ ہے کہ اسے زمین و آسمان کے خالق اور مدبر کی زیارت نصیب ہو، مگر اس انکار کی پاداش میں ان کا داخلہ دربار شاہی میں ممنوع قرار دیا جائے گا اور جب اس ذلت و رسوائی کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹیں گے تو لوٹتے ہی دوزخ میں گر پڑیں گے، اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی وہ یوم الدین ہے جس کا تم انکار کیا کرتے تھے۔

ارباب تقویٰ

اب ان ارباب قدس و طہارت کا تذکرہ آتا ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں عدل و مساوات سے کام لیتے ہیں، اور ہر ایک کے حقوق انصاف کے ساتھ ادا کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے۔

(۱۸) كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْأَبْرَارِ لَفِى عِلِّيِّينَ — یہ بھی سن رکھو کہ نیکوکاروں کے اعمال علیین میں ہیں،

(۱۹) وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا عِلِّيُّونَ (۲۰) كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ (۲۱) يَشْهَدُهُ ٱلْمُقَرَّبُونَ — اور تم کو کیا معلوم کہ علیین کیا چیز ہے، ایک دفتر ہے لکھا ہوا، جس کے پاس مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں،

(۲۲) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ (۲۳) عَلَی الْاَرَائِكِ یَنْظُرُوْنَ (۲۴) تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ (۲۵) یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۶) وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ (۲۷) عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ۔

بے شک نیک لوگ چین میں ہوں گے، تختوں پر بیٹھے ہوئے نظارے کریں گے، تم انکے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کرلوگے، ان کو شراب خالص سربمہر پلائی جائے گی، جس کی مہر مشک کی ہوگی، تو نعمتوں کے شائقین کو چاہیئے کہ اسی سے رغبت کریں، اور اس میں تسنیم کے پانی کی آمیزش ہوگی، وہ ایک چشمہ ہے، جس میں خدا کے مقرب پئیں گے۔

نضرۃ کے معنی تروتازہ اور بارونق ہونے کے ہیں، جس رنگ میں چمک ہوتی ہے اُسے ناضر کہتے ہیں، رحیق اس شراب خالص کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی ملونی نہ ہو، مختوم وہ جس پر مہر لگادی گئی ہو، اور ختام جس سے شیشہ اور بوتل کے موتھ پر مُہر لگائی جاتی ہے، تنافس، باب تفاعل کے وزن پر ہے، اس کے معنی دو شخصوں میں سے ہر ایک کا کسی چیز کو اختیار کرلینے کے ہیں، تنافس دراصل نفیس سے لیا گیا ہے، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں نفیس چیز کو لے لوں، مزاج کے معنی ایک چیز کو دوسری میں ملانے کے ہیں، تسنیم لیا گیا ہے سنّم سے، جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں، اونٹ کے کوہان کو سنام اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بہت اونچا ہوتا ہے، جنت کی تمام شرابوں میں سے بہترین یہی شراب ہوگی اس لیے اس کا نام تسنیم رکھا گیا۔

البتہ صدق و اخلاص، اور انصاف و رواداری برتنے والے علیین میں ہونگے جو تجلیات الٰہیہ کا ایک اعلیٰ ترین مقام ہے، جس کی تعبیر ان الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہے کہ جس طرح زمین کا تعلق آفتاب عالم تاب سے ہے، ایسے ہی جنت تو زمین کی مانند ہے، اور علیین اس کے لیے

سورج کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لیے حضرت ابن عباس اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں: ہو فوق السماء السابعۃ عند قائمۃ العرش الیمنی عرش کے دائیں ستون کے پاس ساتویں آسمان کے اوپر ہے، اس جگہ مقربان درگاہ الٰہی آرام کرتے ہوں گے، ہر قسم کی نعمتوں سے سرفراز ہونے کے بعد دیدار الٰہی سے شرف اندوز ہوں گے، اور ان کی فرحت و سرور کے لیے ان کو ایسی شراب دی جائے گی جو ہر قسم کی برائی سے پاک وصاف ہوگی، پس اگر ریس کرنی ہو تو ان لوگوں کی ریس کرنی چاہیئے: لمثل ہذا فلیعمل العاملون۔

مقربین اور ابرار

تسنیم جو بہترین شراب ہے وہ مقربین کو ملے گی، اور ابرار کو جو شراب میسر ہوگی وہ اس سے کمتر ہوگی، مگر ان کے ساتھ اتنی رعایت اور کر دی جائے گی کہ ان کی شراب میں کبھی کبھی تسنیم بھی ملا دی جائے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں گروہوں کے مراتب میں فرق ہے، اس تفاوت کو مفسرین کرام نے مختلف طریق سے بیان کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ مقربین تو وہ ارباب عشق و شیفتگی ہیں، جن کو محض ذات باری کے ساتھ جنون و وارفتگی ہے، وہ صرف اسی کے عشق میں مجنونانہ بادیہ پیمائی کرتے ہیں، نہ انھیں ثواب کی توقع ہے نہ عذاب کا خوف، لیکن ابرار نعائم الٰہیہ کے امیدوار ہوتے ہیں، اور حسن ثواب کی امید میں عمل صالح کرتے ہیں، ارباب تصوف و احسان کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ مقربین تو وہ ہیں جو فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مراتب عالیہ پر فائز ہو گئے، اور ابرار وہ ہیں جنھیں انشراح صدر تو حاصل ہو گیا مگر ابھی تک وہ فنا و بقا کے منازل طے نہیں کر سکے، کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ہر عمل نیک کا ایک درجہ عالی اور ایک سافل ہے، اس علو و تسفل میں صدق و اخلاص نیت اور آداب سنن کی نگہداشت کو دخل ہے، جس نے درجۂ

کمال کو پالیا، وہ مقرب بن گیا ورنہ ابرار میں شامل ہوگا۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں میں استاد اور شاگرد کا فرق ہے، مقرب فطرۃً صالح ہے، اور ابرار تعلیمات الٰہیہ کی پابندی سے مقرب کے ساتھ مل جاتے ہیں اسکو یوں سمجھ لو کہ ایک شخص پیدائشی حسین ہے، اور دوسرا بن سنور کر خوبصورت ہوگیا ہے، اسی طرح مقرب تو فطرت ہی سے عمدہ ترین اخلاق لے کر آتا ہے اور ابرار اس سے اخذ و قبول کر کے اس کے ساتھ مل جاتے ہیں، دنیا میں ان لوگوں کو مقربین ہی کے فیض صحبت سے توحید و معرفت کی شراب نصیب ہوئی تھی، اس لیے مرنے کے بعد بھی انہیں چشمۂ تسنیم سے شراب حقیقت پینے کو ملے گی۔

تقسیم کی اصلی غرض

اس فرق و امتیاز کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہر شخص کی انتہائی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اخلاق صالحہ کی پابندی کرے، خواہ یہ اس کا طبعی تقاضا ہو، یا اس میں اسے تکلف سے کام لینا پڑے جس طریق پر بھی وہ نظام صالح کی پابندی کرے گا اللہ کی نعمتوں سے محروم نہ رہے گا، بلکہ مقربین اور ابرار کے گروہ میں داخل ہوگا۔

باہمی تقابل۔

(۲۹) إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ	جو گنہگار یعنی کفار ہیں، وہ دنیا میں مؤمنوں سے ہنسی
الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ (۳۰) وَإِذَا	کیا کرتے تھے، اور جب ان کے پاس سے گذرتے
مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ (۳۱) وَإِذَا انقَلَبُوا	تو حقارت سے اشارے کرتے، اور جب اپنے گھر کو
إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ (۳۲) وَإِذَا	لوٹتے تو اتراتے ہوئے لوٹتے اور جب ان
رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ	مؤمنوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ گمراہ ہیں، حالانکہ وہ انپر
(۳۳) وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ۔	نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔

تیغامزون لیا گیا ہے غمز سے، اور اس کے معنی ہیں پلک اور بھوں سے اشارہ کرنا۔

ارباب تطفیف نہ صرف اپنے جرم کو جرم نہیں سمجھتے، بلکہ ان پر ہنسی کرتے ہیں جو اس گناہ میں ان کے شریک نہیں ہوتے، اپنی آنکھوں سے ان کی تحقیر کرتے ہیں، اپنے گھروں میں بھی انکا تذکرہ کرکے خوب قہقہے لگاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مسلمان بڑے بے وقوف ہیں جو دنیاداری اور تجارت کے اصول سے بالکل ناواقف ہیں، بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ کیا آپ ان کے نگراں ہیں جو اس قدر رنج وغم کا اظہار کر رہے ہیں۔

الجزاء من جنس العمل

(۳۴) فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ (۳۵) عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ (۳۶) هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔

تو آج مومن کافروں سے ہنسی کریں گے، اور تختوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہوں گے، لوکافروں کو ان کے عملوں کا پورا پورا بدلا مل گیا۔

قیامت کے روز یہی مسلمان جن کو ضعیف و کمزور اور بے وقوف خیال کیا جاتا تھا، ان کافروں پر ہنستے ہوں گے، اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کی وجہ سے عزت واکرام کے اعلیٰ ترین مراتب و درجات پر فائز ہوں گے، اب کفار کو اپنی حقیقت اصلیہ نظر آجائے گی، دوسری جگہ ان کفار کی حالت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: قال اخسئوا فیها ولا تکلمون، انه کان فریق من عبادی یقولون ربنا آمنا، فاغفر لنا وارحمنا، وانت خیر الراحمین، فاتخذتموهم سخریا حتی انسوکم ذکری، وکنتم منهم تضحکون، انی جزیتهم الیوم بما صبروا انهم هم الفائزون (۲۳: ۱۰۸ تا ۱۱۱) خدا فرمائے گا کہ اسی میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو، میرے بندوں میں ایک گروہ تھا جو دعا کیا کرتا تھا کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے، تو تو ہم کو بخش دے، اور ہم پر رحم کر، اور تو سب سے بہتر رحم

کرنے والا ہے، تو تم ان سے تمسخر کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے پیچھے میری یاد بھی بھول گئے،
اور تم ہمیشہ ان سے ہنسی کیا کرتے تھے، آج میں نے ان کو ان کے صبر کا بدلہ دیا کہ وہ کامیاب ہو گئے۔
حدیث میں آتا ہے: الا اخبرکم باہل الجنۃ، کل ضعیف متضعف لو اقسم علی اللہ لابرہ، الا
اخبرکم باہل النار، کل عتل جواظ متکبر، میں تمھیں بتاتا ہوں کہ جنتی کون لوگ ہیں، وہ جو ضعیف
ہیں، جنھیں لوگ عاجز و درماندہ خیال کرتے ہیں، مگر اللہ کے نزدیک ان کے تقرب کی یہ کیفیت ہے
کہ اگر وہ کسی کام کے لیے خدا کی قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو پورا کر دیتا ہے، اور ہر سخت، متکبر اور
کنتر دوزخی ہے۔



الانشقاق

(آیات، ۲۵)

تلخیص مضامین

ابتدا میں حادثہ قیامت کے بعض واقعات بیان کرکے بتایا کہ ہر ایک شخص دنیا کی زندگی میں تکلیف اُٹھا کر انجام کار اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا، جہاں اعمال نامے دائیں و بائیں ہاتھ میں ہر ایک انسان کو مل جائیں گے، اصحٰب الیمین تو جنتی، اور اصحٰب الشمال دوزخی ہوں گے اس لیے کہ یہ لوگ جزائے اعمال کا انکار کرتے تھے، پھر مناظر قدرت پیش کرکے اس نظریہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی کہ انسان یا تو ترقی کرتا ہے یا تنزل کے گڑھے میں گرتا ہے، جب حالت یہ ہے تو اسے چاہیے کہ وہ نیک کام کرے، مگر اپنی غفلت کی وجہ سے وہ اسکی پروا نہیں کرتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام اعمال کی نگرانی کرتا ہے، اور مرنے کے بعد اسی شخص کو کامیابی نصیب ہوگی جو اس دنیا میں نیک زندگی بسر کرے گا۔

ان سطروں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جب انسانی حیات کا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں جاتا، بلکہ اس کا ہر قدم آگے کی طرف بڑھتا یا پیچھے کی طرف ہٹتا ہے، تو پھر وہ نیک کام کیوں نہ کرے جو اسے دنیا و آخرت میں سود مند ہو، اور یہی اس سورۃ کا موضوع ہے۔

یا ایھا الانسان انک کادح

ہلاکت و بربادی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ (۲) وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ (۳) وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ (۴) وَاَلۡقَتۡ مَا فِیۡهَا وَتَخَلَّتۡ (۵) وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ۔

جب آسمان پھٹ جائے گا، اور اپنے پروردگار کا فرمان بجا لائے گا، اور اُسے واجب بھی یہی ہے، اور جب زمین ہموار کر دی جائے گی، اور جو کچھ اس میں ہے اُسے نکال کر باہر ڈال دیگی اور بالکل خالی ہو جائیگی اور اپنے پروردگار کے ارشاد کی تعمیل کرے گی اور اُسکو لازم بھی یہی ہے، تو قیامت قائم ہو جائے گی۔

موجودہ نظام صرف اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ فرزند آدم اس سے فائدہ حاصل کرے، جب وہ خود ہی نہ رہا تو پھر اس کائنات کی کیا ضرورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان کو بھی فنا کر دیا جائے گا، اور زمین میں اب تک جو کچھ پوشیدہ تھا باہر نکل آئے گا، یہ سب ایک حکم کا نتیجہ ہوگا، اور کسی کو طاقت نہ ہوگی کہ اس کا خلاف کر سکے۔

اصحب الیمین

(۶) یَاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی

اے انسان، تو اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے میں خوب

رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (۷) فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ (۸) فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا (۹) وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا۔

کوشش کرتا ہے، سو اس سے جا ملے گا، تو جس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے حساب آسان لیا جائے گا، اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے گا۔

اعمال کے اعتبار سے انسان کی تین ہی حالتیں تصور میں آسکتی ہیں:۔

(۱) اخلاق فاضلہ و اعمال صالحہ کی پابندی کی بناپر ترقی کرتا چلا جائے۔

(۲) فسق و فجور اور بدعملی و بطالت کی وجہ سے قعر مذلت و نکبت میں گرتا جائے۔

(۳) سکون کی حالت قائم ہے، اور اب وہ نہ تو آگے بڑھتا ہے اور نہ پیچھے ہٹتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تیسری حالت صرف فرض کر لی گئی ہے، ورنہ در اصل یہ کوئی چیز نہیں اس لئے شریعت بھی صرف پہلی دو صورتوں سے بحث کرتی ہے، حدیث میں بھی انھیں دو کا تذکرہ ہے، اور آیت زیر بحث بھی اسی قانون کو بیان کرتی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کام میں ہمیشہ مصروف رہتا ہے اور اسے اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار بھی نہیں، تا آنکہ وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو جاتا ہے، وہاں اسے اگر اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں مل گیا تو کامیاب رہا، اس سے اگر حساب طلب بھی کیا جائے گا تو بس یوں ہی سا۔

بخاری میں ہے: من نوقش الحساب عذب، جس شخص سے خوب ٹھونک بجا کر حساب لیا گیا، وہ ضرور معذب ہوگا، اس پر حضرت عائشہؓ نے یہ شبہہ ادا کیا کہ قرآن میں تو فسوف یحاسب حساب یسیرا آتا ہے، پھر یہ اختلاف کیسا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لیس ذٰلک حساب ولکن ذاک العرض، من نوقش الحساب عذب، یہ حساب یسیر بھی کوئی حساب ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ان چیزوں کو اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، اور بس، ورنہ

جس سے باقاعدہ حساب طلب کیا گیا، تو اس کی خیر نہیں، اسی لیئے آپ ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللھم حاسبنی حسابا یسیرا، بیہقی میں ہے کہ جس شخص میں یہ تین صفات ہوں گی، قیامت کے دن اس سے حساب یسیر لیا جائے گا: تعطی من حرمک، وتعفو عمن ظلمک، وتصل من قطعک، تو اس کو دے جو تجھے محروم کر دے، جو تجھ پر ظلم کرے تو اس سے درگذر کر، اور قاطع رحم کے ساتھ صلہ رحمی کر۔

مجرمین کے نتائج

(۱۰) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ	اور جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا
(۱۱) فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا (۱۲) وَّيَصْلٰى	جائے گا، وہ موت کو پکارے گا، اور دوزخ میں داخل
سَعِيْرًا (۱۳) اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا	ہوگا، یہ اپنے اہل وعیال میں مست رہتا تھا، اور
(۱۴) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ (۱۵) بَلٰٓى	خیال کرتا تھا کہ خدا کی طرف پھر کر نہ جائے گا، ہاں ہاں
اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا۔	اس کا پروردگار اس کو دیکھ رہا تھا۔

ثبور مشتق ہے مثابرۃ سے جس کے معنی دوام اور مواظبت کے ہیں، آخرۃ کی موت و ہلاکت بھی غیر منقطع ہوگی، اس لیئے اسے ثبور کہا جاتا ہے، حور رجوع کو کہتے ہیں، اسی لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راحت کے بعد رنج، فراخی کے بعد تنگ دستی اور ترقی کے بعد تنزل سے پناہ مانگا کرتے تھے: اللھم انی اعوذ بک من الحور بعد الکور۔

لیکن جن لوگوں کا اعمال نامہ پشت کی طرف سے پیش کیا جائے گا وہ ہلاکت و بربادی کے لیے مخصوص ہوں گے، اور دوزخ کے سوا ان کو اور کوئی جگہ نہ ملے گی، یہ بدبخت دنیا کے عیش میں منہمک تھے، انھیں اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کا خیال بھی نہ تھا، اور یہ اس گمان باطل میں تھے کہ سرور وشادمانی کی یہ کیفیت دائمی ہے، مگر یہ امید سراب سے زیادہ نہ تھی، اللہ کی نظر ان کے ایک ایک عمل پر تھی، وہ بھلا ان کو کیسے مہمل چھوڑ سکتا تھا۔

مناظرِ قدرت

(۱۶) فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۱۷) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۱۸) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۱۹) لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ

ہمیں شام کی سرخی کی قسم اور رات کی اور جن چیزوں کو وہ اکٹھا کر لیتی ہے، اور چاند کی جب کامل ہو جائے کہ تم درجہ بدرجہ رتبۂ اعلیٰ پر چڑھو گے۔

اصل لغت کے اعتبار سے شفق کے معنی رقت کے ہیں، اسی لئے رقت قلب کو شفقت کہتے ہیں، یہاں وہ سرخی مراد ہی جو غروب آفتاب کے بعد آسمان کے کناروں پر باقی رہتی ہے، وسق کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اتساق، اجتماع و تکامل۔

اللہ تعالےٰ نے زمین و آسمان کی ہر چیز انسان کی ہدایت و راہ نمائی کیلیے بنائی ہے مگر وہ اس میں درس و فکر سے کام نہیں لیتا، مناظر قدرت تمہارے سامنے ہیں، ان میں غور کرو تو بہت سے حقائق مستورہ بے حجاب ہوں گے، مغرب کے وقت ذراسی تاریکی شروع ہوتی ہے پھر بڑھتے بڑھتے تمام عالم پر چھا جاتی ہی، اور حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے پاس کی چیز بھی نہیں دیکھ سکتا، یہ ایک عالم تھا، اب چاند کو دیکھو وہ ابتدا میں بالکل ایک باریک خط کی طرح دکھائی دیتا ہی، مگر چند روز کے بعد بدر کامل بن کر تمام دنیا کو روشن کر دیتا ہی۔

یہ قدرتی مناظر تمہارے سامنے ہیں، اگر تم غور کرو تو عبرت و بصیرت کی صدہا راہیں اپنے سامنے کشادہ پاؤگے، انسانی اعمال کی بھی یہی کیفیت ہی، اگر ایک شخص برائی کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے قلب پر پڑ جاتا ہی، اگر اس نے توبہ کر لی تو بہتر ورنہ وہ سیاہی ترقی کرتی جاتی ہے تا آنکہ اس کا دل بالکل تاریک ہو جاتا ہی، اور اب وہ نور کی بجائے ظلمت میں بڑھتا ہوا چلا جاتا ہی، اور اگر اس نے نیکی کی تو اسے نیکی میں مدد ملے گی، تا آنکہ وہ خدائے قدوس کے دربار میں قلب سلیم لے کر حاضر ہو، ترقی دونوں کی ہوگی، ایک کی نور کی طرف اور دوسرے کی ظلمت

کی جانب، سکون کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اعتبار

(۲۰) فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۱) وَإِذَا
قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ
(۲۲) بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ (۲۳)
وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ (۲۴) فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۵) إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ

تو ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے، اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے، بلکہ کافر جھٹلاتے ہیں، اور خدا ان باتوں کو جو یہ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں، خوب جانتا ہے تو ان کو دکھ دینے والے عذاب کی خبر سنا دو، ہاں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

جب حالت یہ ہے کہ ہر ایک انسان اپنے اخلاق و اعمال میں برابر ترقی ہی کرتا رہتا ہے تو پھر برائی کرنے والے کو کیا ہو گیا، نیکی اور صداقت میں آگے بڑھنے کی کیوں نہیں کوشش کرتا، دنیا میں بھی آرام سے ملے گا، اور آخرۃ بھی سدھر جائے گی، اقتضائے عقل تو یہی تھا کہ اس میں خضوع اور انابت الی اللہ کے جذبات حقہ پیدا ہوتے، مگر ان حقائق ثابتہ کے باوجود اس کی حالت یہ ہے کہ وہ جزائے اعمال کا برابر انکار کیے چلا جاتا ہے، اور اس زعم باطل میں گرفتار ہے کہ قیامت نہیں ہو گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے ایک ایک کام کو احاطہ کیے ہوئے ہے، ان اعمال فاسقہ کی پاداش میں اسے عذاب سے نجات نہ مل سکے گی، اور ارباب ایمان و اخلاص کی فوز و کامرانی میں کوئی شبہ نہیں۔

البروج

(آیات، ۲۲)

تلخیص مضامین

ابتدا میں چند قسمیں بیان کیں، پھر لف ونشر غیر مرتب کے طور پر سب سے پہلے شاہد و مشہود کا قصّہ بیان کیا، پھر یوم موعود کا فیصلہ سُنایا، اور آخر میں تاریخ عالم کے چند واقعات ذکر کرکے اس حقیقت پر مہر لگادی کہ مخالفین اسلام ضرور برباد ہوں گے، اور یہی اس سورۃ کا موضوع ہے۔



مخالفین اسلام یقیناً برباد ہوں گے

اقسام ثلثہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ (۲) وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ (۳) وَشَاهِدٍ وَّمَشۡهُوۡدٍ۔

آسمان کی قسم جس میں برج ہیں، اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے، اور حاضر ہونے والے کی، اور اس کی جس کے پاس حاضر کیا جائے۔

بعض لوگوں نے قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کی تفسیر میں ایسی باتیں بیان کی ہیں جن سے یہ کتاب عزیز کبھی بحث نہیں کرتی، اور نہ اس کے دائرہ میں یہ چیز داخل ہے، علم نجوم وہیئت کے ماتحت قرآنی آیات کی تفسیر کرنا یقیناً اس کے موضوع سے دور نکل جانا ہے، صحابہ کرام کی نسبت ہمیں معلوم ہے کہ وہ ان غیر ضروری مباحث کی طرف کبھی توجہ نہ کرتے تھے، بلکہ سادہ اور عام فہم مطلب لیتے، اور اسی پر عمل کرتے۔

والسماء ذات البروج

اس سورۃ کا موضوع آپ کے سامنے ہے: ان الذین فتنوا المومنین والمومنت ثم لم یتوبوا فلھم عذاب جہنم ولھم عذاب الحریق، اس دعوی پر اللہ تعالےٰ نے چند شہادتیں پیش کی ہیں، سب سے پہلے تم اس آسمان کی طرف نگاہ بلند کرو، جو نجوم وکواکب سے درخشندہ ہے جس کے وجود پر ہزارہا سال گذر چکے ہیں، جس نے صدہا اقوام کے عروج وزوال اور علو وتسفل کو دیکھا ہے پس جب سے

یہ آسمان قائم ہے، اور جس وقت سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے، اس وقت سے لے کر آج تک کے حالات و واقعات کا درس و مطالعہ کرو، تاریخ پڑھو، اور قوموں کے ہبوط و صعود کے فلسفہ میں بحث و نظر کرو، تو تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ آج تک جس فرد یا قوم نے کلمۂ حق کی مخالفت کی ہے، اور سچائی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں، وہ ہمیشہ برباد ہوئی ہے، عاد و ثمود کی قومیں تمہیں یاد ہیں، بابل و نینوا کے کھنڈرات کو جا کر دیکھو، کلدانیوں اور اشوریوں سے دریافت کرو، تمام اقوام عالم اس سنۃ اللہ کا زبان حال سے اقرار و اعلان کر رہی ہیں کہ قانون الٰہی کی مخالفت کر کے کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔

الیوم الموعود

اگر تاریخ کے اوراق میں، اور قوموں کے تسلط و تنزع میں تمہارے لیے کوئی عبرت و بصیرۃ نہیں، اور تم ان سے نصیحت اخذ نہیں کرتے، تو تمہارے پاس الہامی کتابیں ہیں، انبیاء کے مکاشفات ہیں، ان لوگوں کے حالات و واقعات ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ملائکۃ الرحمٰن کو دیکھا ہے، انہوں نے عالم غیب کے سرائر و محجوبات کو بے نقاب کیا ہے، اور قیامت اور نتائج اعمال پر بحث کی ہے، وہ بھی اس حقیقت ثابتہ پر مہر لگاتے ہیں کہ اسلام کی مخالفت کرنے والے انجام کار ذلیل و رسوا ہوں گے: الا ان حزب الشیطٰن ھم الخسرون۔

شاہد و مشہود۔

پھر اگر انبیاء کے مکاشفات و الہامات بھی تمہارا اطمینان نہیں کر سکتے تو شاہد و مشہود کا واقعہ تمہاری عبرت کے لیے بس کرتا ہے، چند نوجوان ایمان لاتے ہیں، پادشاہ وقت ان کو بت پرستی پر مجبور کرتا ہے، جب وہ کسی طرح سے حق کو نہیں چھوڑتے، تو انھیں آگ کی نذر کرتا ہے مگر انجام کیا ہوتا ہے، تماشہ دیکھنے والے بھی نذر آتش ہو جاتے ہیں، اور انکا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔

پس تاریخ اقوام و ملل انبیاء کرام کے مکاشفات و الہامات، اور شاہد و مشہود کا واقعہ، تینوں اس امر پر شاہد ہیں کہ مخالفین حق اور معاندین اسلام ضرور تباہ ہو کر رہیں گے، اور مسلمان ہی انجام کار شاد کام و بامراد ہوں گے۔

شہادت کی تفصیل

(۴) قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ (۵) النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ (۶) اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ (۷) وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ۔

خندقوں کے کھودنے والے ہلاک کر دیے گئے، یعنی آگ کی خندق جس میں ایندھن جھونک رکھا تھا، جبکہ وہ اُن کے کناروں پر بیٹھے ہوئے تھے، اور جو سختیاں اہلِ ایمان پر کر رہے تھے، ان کو سامنے دیکھ رہے تھے۔

اخدود کے معنی زمین کو شق کرنے اور اس کو مستطیل کھودنے کے ہیں، اس کی جمع اخادید آتی ہے اور اس کا مصدر خد ہے۔

اب لف و نشر غیر مرتب کے طور پر ان اقسام کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، جن سے اس دعوی پر استدلال کیا گیا ہے کہ مخالفین اسلام ضرور برباد ہوں گے، سب سے آخر میں شاہد و مشہود کا تذکرہ تھا اس لیے سب سے پہلے اسی کو لیا گیا۔

ان آیات میں کن لوگوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں، احادیث میں مختلف لوگوں کا تذکرہ ہے، مگر غرض سب کی ایک ہی ہے، اور اگر جزئیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ماحصل تمام قصص کا ایک ہی ہے، اور وہ وہی ہے جس کو ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ چند حق پرستوں کو اس ملک کے بادشاہ نے بت پرستی پر مجبور کیا، جب وہ کسی طرح اس کے لیے تیار نہ ہوے تو اس نے ان کو جلانے کی خاطر بڑی بڑی خندقوں میں لکڑیاں جمع کر کے آگ تیار کی، جب وہ خوب روشن ہو گئی تو ان ارباب ایمان کو اس میں جھونک دیا، اور اس دردانگیز و ہیبت ناک منظر کو دیکھنے کے لیے

شہر کے تمام لوگ اور اُمرا اور روسائے سلطنت خندقوں کے کناروں پر مبٹھ گئے، اسی دوران میں آگ کے شعلے اس قدر بلند ہوے کہ اُن کو بھی جلا کر خاک کا ڈھیر کر دیا جو اس تماشہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ان آیات میں یہی واقعہ بیان کیا گیا ہی، اور اس میں نہ صرف مشرکین مکہ کے لیے درس عبرۃ تھا، جو مسلمانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے، بلکہ آج بھی قرآن حکیم ببانگ دھل اس قانون فطرت کا اعلان کرتا ہی کہ جو مسیحی اقوام اسلامی حکومتوں کو برباد کرنے کی فکر میں ہیں وہ اس شیطنیت سے باز آجائیں، ورنہ اللہ کے آہنی پنجہ کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے، اور اس کی گرفت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ فہل من مذکر۔

جرم کی نوعیت

(۸) وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۹) الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔	ان کو مومنوں کی یہی بات بری لگتی تھی کہ وہ خدا پر ایمان لائے ہوے تھے، جو غالب اور قابل ستائش ہی، جس کی آسمانوں اور زمین میں بادشاہت ہے، اور خدا ہر چیز سے واقف ہی۔

ان نوجوانوں کا اگر کوئی جرم تھا تو یہ کہ وہ ایک اللہ کے پرستار بن گئے تھے، اور یہ ایک حقیقت ثابتہ ہی کہ شخصی حکومتوں اور سرمایہ داروں کے نزدیک سب سے بڑا جرم یہی رہا ہے کہ ایک شخص کی گردن ان فراعنہ کے آگے کیوں نہیں جھکتی۔

جس وقت جادوگر حضرت موسیٰؑ کے خدا پر ایمان لے آئے، تو فرعون نے ان کو راہ حق سے منحرف کرنے کی پوری کوشش کی، مگر جب وہ اس میں ناکام رہا تو اس نے یوں دھمکی دی: لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف، ثم لاصلبنکم اجمعین، (۷: ۱۲۴) میں پہلے تو تمہارے ایک طرف کے ہاتھ

اور دوسری طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا، پھر تم سب کو سولی چڑھا دوں گا، مگر وہ ان باتوں سے مطلق خوف زدہ نہ ہوئے، انھوں نے جواب دیا: وما تنقم منا الا ان آمنا بایات ربنا لما جاءتنا (۷: ۱۲۶) اور اس کے سوا تجھ کو ہماری کونسی بات بری لگتی ہے کہ جب ہمارے پروردگار کی نشانیاں ہمارے پاس آگئیں، تو ہم ان پر ایمان لے آئے، فرزندان اسلام کو بھی جب سرزمین مکہ سے جلا وطن کیا گیا تو ان کا بھی یہی گناہ تھا کہ وہ ایک ہی خدا کے پوجنے والے تھے: الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ (۲۲: ۴۰) یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا، ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے حضرت شعیب علیہ السلام کو جو ان کی قوم نے اخراج عن الوطن کی دھمکی دی تھی، تو اس کا سبب بھی اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ خدائے واحد کے آگے خمیدہ گردن تھے: قال الملا الذین استکبروا من قومہ لنخرجنک یشعیب والذین آمنوا معک من قریتنا او لتعودن فی ملتنا (۷: ۸۸) تو ان کی قوم میں جو لوگ سردار اور بڑے آدمی تھے وہ کہنے لگے کہ شعیب یا تو ہم تم کو اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنے شہر سے نکال دیں گے، یا تو تم ہمارے مذہب میں آجاؤ۔

کیا یہ ظالم و جابر حکومتیں اس خیال میں ہیں کہ جس قدوس حق نواز سے انھوں نے لو لگائی ہے، وہ اپنے عاجز و درماندہ بندوں کی امداد نہ کرے گا، وہ خدا عزیز ہے، زمین و آسمان کی حکومت اس کے قبضہ میں ہے اور نہایت ہی دوربین نگاہوں سے دونوں جماعتوں کے اعمال کو دیکھ رہا ہے، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان تو مغلوب ہوں، اور کافر غالب آجائیں: ان اللہ لا یحب الکافرین۔

الہامات انبیاے کرام

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ — جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیفیں

ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ	دیں اور توبہ نہ کی اُن کو دوزخ کا عذاب بھی ہوگا اور
عَذَابُ الْحَرِيقِ (۱۱) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا	جلنے کا عذاب بھی ہوگا اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي	کام کرتے رہے ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ۔	نہریں بہ رہی ہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔

شاہد و مشہود کے بعد اب تم تمام صحائف و اسفار آسمانی کا درس و مطالعہ کرو، اور انبیاے کرام کے الہامات کو دیکھو وہ بھی اسی حقیقت کبریٰ پر متفق ہوں گے:۔

(الف) جن لوگوں نے حق پرستوں پر ظلم کیا انھیں ہر طرح کی تکلیف و مصیبت میں ڈالا اور پھر ان جرائم سے توبہ بھی نہ کی تو وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے، اور جب کبھی حق و باطل کا تصادم ہوگا، تو پرستارانِ باطل ہی ذلیل و رسوا ہوں گے۔

(ب) ارباب ایمان کے لیے کامیابی حتمی ہے، انھیں ہر قسم کی نعمتیں نوازش ہوں گی اور وہ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کریں گے۔

پس انبیاء کے الہامات، اولیاء کے مکاشفات اور ملائکۃ الرحمٰن سے مکالمہ کرنے والے سب اسی فطرۃ اللہ پر مہر لگاتے ہیں، اور اسی سنت خداوندی کا بابانگ دھل اعلان کرتے ہیں۔

اگر عذاب میں تاخیر ہو

(۱۲) إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ (۱۳)	بے شک تمہارے پروردگار کی پکڑ بہت سخت ہے وہی
إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ (۱۴) وَهُوَ الْغَفُورُ	پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ زندہ کرے گا اور
الْوَدُودُ (۱۵) ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ (۱۶)	وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے، عرش کا مالک
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ	بڑی شان والا، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سنت اللہ وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض

اوقات ظالموں کو باوجود ظلم وجور کامیابی ہوتی ہے، اس لیے عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پرستاران حق بے یار ومددگار چھوڑ دیے گئے ہیں، بلکہ کبھی کبھی یہ خیال یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ خود مسلمان ہی کو غلط کار قرار دیا جاتا ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ فراعنہ عصر کو اس ظاہر فریب کامیابی پر اترانا نہ جانا چاہیے اگرچہ اس وقت انھیں فتح وکامرانی نصیب ہو رہی ہے، مگر وہ یاد رکھیں کہ یہ ایک قسم کی مہلت ہے جو انھیں دی جا رہی ہے، وہ جب پکڑنے پر آئے گا تو اس کی پکڑ بڑی ہی سخت ہوگی: ان اخذہ الیم شدید۔ سورہ اعراف میں آتا ہے: والذین کذبوا بآیاتنا سنستدرجھم من حیث لا یعلمون، واملی لھم ان کیدی متین (۷: ۱۸۲ و ۱۸۳) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا، اور میں ان کو مہلت دیے جاتا ہوں، میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ سورہ آل عمران میں فرمایا: ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم خیر لانفسھم، انما نملی لھم لیزدادوا اثما ولھم عذاب مھین (۳: ۱۷۸) اور کافر لوگ یہ خیال کریں کہ ہم جو ان کو مہلت دیے جاتے ہیں ان کے حق میں اچھا ہے، نہیں بلکہ ہم ان کو اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ اور گناہ کرلیں، آخر کار ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

الغرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قانون بیان فرما دیا کہ اگر مخالفین اسلام کو کبھی کامیابی ہو جائے تو فرزندان توحید کو اس سے پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ یہی فتح ونصرت ان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی، اور یہ خود اپنے ہاتھوں ان تمام اسباب ووسائل کو فراہم کریں گے جو ان کی بربادی کا باعث ہوں: ان ربک لبالمرصاد، اگر مسلمان اپنے گردوپیش نظر دوڑائیں تو اب بھی اپنے ماحول میں ان حقائق کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس کائنات میں اللہ کی مختلف صفات مصروف عمل ہیں، بعض اوقات وہ نئے سرے سے ایک چیز کو پیدا کرتا ہے، اور کبھی اسی کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے، یہی عادت اس کی قوموں

اور ملّتوں کے متعلق بھی ہے، اگر ایک حکومت ظلم کرتے کرتے انتہا تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کو بالکل برباد کر دیا جاتا ہے، اور دوسری قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے، سورہ دخان میں اس سنۃ اللہ کو یوں بیان کیا گیا ہے: کم ترکوا من جنت وعیون وزروع ومقام کریم ونعمۃ کانوا فیہا فکہین، کذلک واورثنٰھا قوماً آخرین، فما بکت علیہم السماء والارض وما کانوا منظرین، ولقد نجینا بنی اسرائیل من العذاب المہین من فرعون انہ کان عالیاً من المسرفین، ولقد اخترنٰھم علی علم علی العالمین (۴۴: ۲۵ تا ۳۲) وہ لوگ بہت سے باغ اور چشمے چھوڑ گئے، اور کھیتیاں اور نفیس مکان، اور آرام کی چیزیں جن میں عیش کیا کرتے تھے، اسی طرح ہوا، اور ہم نے دوسرے لوگوں کو ان چیزوں کا مالک بنا دیا، پھر ان پر آسمان اور زمین کو رونا آیا، اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی، اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب سے نجات دی یعنی فرعون سے، بے شک وہ سرکش اور حد سے نکلا ہوا تھا، اور ہم نے بنی اسرائیل کو اہل عالم سے دانستہ منتخب کیا تھا۔

لیکن اگر ایک قوم اپنے اعمال فاسقہ سے توبہ کر لے، تو اللہ تعالیٰ اُسکو چشمۂ حیات پر لے آتا ہے اور اس کو زندگی نوازش فرماتا ہے: ثم رددنا لکم الکرۃ علیہم وامددنٰکم باموال وبنین وجعلنٰکم اکثر نفیرا (۱۷: ۶) پھر ہم نے دوسری بار تم کو ان پر غلبہ دیا، اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی، اور تم کو جماعت کثیر بنا دیا، قوم یونس کے متعلق آتا ہے: فلولا کانت قریۃ آمنت فنفعہا ایمانہا الا قوم یونس لما آمنوا کشفنا عنہم العذاب الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا ومتعنٰہم الی حین، (۱۰: ۹۸) تو کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اس کا ایمان اُسے نفع دیتا، ہاں یونس کی قوم کہ جب ایمان لائی تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلت کا عذاب دور کر دیا، اور ایک مدت تک فوائد دنیاوی سے ان کو بہرہ مند رکھا۔

اقوام و امم کے عروج و زوال کا یہی قانون ہے، جو قوم قعر ذلت میں گرتی ہے، وہ اپنے اعمال قبیحہ

کی بنا پر گرتی ہے مگر اللہ غفور و ودود بھی ہے: ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم، اس کی مغفرۃ کی شان ملاحظہ ہو: ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء، اس کی ایک صفت سبقت رحمتی علے غضبی بھی ہے پھر بھلا وہ کیسے بنی آدم کو چھوٹے چھوٹے گناہوں کی وجہ سے عذاب دے گا، بلکہ اس کا عفو عام اور اس کی رحمت سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

لیکن انسان اس رحمت کی وجہ سے مغرور نہ ہو جائے، وہ ذوالعرش المجید فعال لما یرید بھی ہے وہ ملک و سلطنت کا مالک ہے، جلالت و کبریائی میں کوئی اس کا عدیل نہیں، اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے، پس ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کی تمام صفات کو ہمیشہ سامنے رکھے اور ہر حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی سفاکی و بربریت کے وقت دیکھ لے کہ ارباب صدق و اخلاص کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ تو نہیں بنا رہی ہے۔

تاریخی شہادت

(۱۷) هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ — بھلا تم کو لشکروں کا حال معلوم ہوا ہے، یعنی فرعون

(۱۸) فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ۔ — اور ثمود کا۔

اب تک موضوع سورت پر دو قسم کی شہادتیں بیان ہو چکی ہیں:

(۱) شاہد و مشہود کا واقعہ جس سے عرب کے لوگ خصوصاً واقف ہیں۔

(۲) انبیاء کرام کے الہامات جن سے بڑھ کر واقعات قیامت اور نتائج اعمال اور کوئی شخص بیان نہیں کر سکتا۔

اب ان آیات میں فرعون و ثمود کے حالات سے استشہاد کیا گیا، ان کے واقعات اوراق تاریخ میں محفوظ ہیں، اور ہر شخص ان سے واقف ہے، اس لیے صرف اشارہ کر دیا، ذہن خود بخود نتیجہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

کیا مخالفین اسلام اور مسیحی حکومتوں کو یہ واقعات یاد ہیں، اگر چشم بصیرت وا ہے تو وہ ان حقائق کو دیکھیں اور دول اسلام کی بیخ کنی سے باز آجائیں ورنہ ان کے ساتھ مستقبل قریب میں وہی ہوگا، جو فرعون و ثمود کے ساتھ ہوا۔

کفار کا انکار

(۱۹) بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ لیکن کافر جان بوجھ کر تکذیب میں گرفتار ہیں اور خدا
(۲۰) وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ۔ بھی ان کو گرداگرد سے گھیرے ہوئے ہے۔

باوجود ان تاریخی واقعات اور دوسرے دلائل کے کفار اس امر کو تسلیم نہیں کرتے کہ عاقبت کار مسلمان ہی کامیاب ہوں گے، اس لیے کہ وہ فرزندان اسلام کی بے سروسامانی، بدنظمی اور فرقہ بندی کو دیکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کی عالم گیر برادری کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، ادھر ان کو اپنی کثرت تعداد، فراوانی دولت، اور آلات حرب پر ناز ہے، ان حالات میں اس سُنۃ اللہ پر ان کو یقین آئے تو کیسے، مگر ان مخالفین اسلام کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ ان کو سب طرف سے گھیرے ہوئے ہے، وہ ان کی داخلی اور خارجی قوتوں کو جانتا ہے، اور جس وقت چاہے انہیں ہلاک کر سکتا ہے۔

یہ فیصلہ اٹل ہے

(۲۱) بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ (۲۲) فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں، بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے لوح محفوظ میں لکھا ہوا۔

ان آیات کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو عام مفسرین نے بیان کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نہایت ہی عظیم و جلیل کتاب ہے، جیسا کہ سورۂ عبس میں گزر چکا، اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی اسی قسم کی آیات اس کے متعلق بیان کی گئی ہیں، مثلاً ایک جگہ فرمایا: انه لقرآن کریم فی کتاب مکنون، لا یمسه الا المطهرون، تنزیل من رب العالمین (۵۶: ۷۷ تا ۸۰) یہ بڑے رتبہ کا قرآن ہے

جو کتاب محفوظ میں لکھا ہوا ہی، اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں، پروردگار عالم کی طرف سے اتارا گیا ہی، دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: وانہ لکتب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (۴۱: ۴۱ و ۴۲) اور یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہی، اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہی نہ پیچھے سے، اور دانا اور خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہی۔

غرض یہ ہی کہ مکی زندگی ہی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی معرفت اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ قرآن کریم میں کسی قسم کی تحریف ممکن نہیں، اور کوئی بڑی سے بڑی حکومت اس میں ردوبدل کرنے پر قادر نہ ہو گی اس لیے کہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کا وعدہ جس طرح ماضی کے لیے تھا، ویسا ہی مستقبل کے لیے بھی ہے۔

ربط آیات کے لحاظ سے ان آیتوں کا یہ مطلب بھی قرار دیا جا سکتا ہی کہ اس سورۂ مبارکہ میں جس حقیقت کبری کا اعلان کیا گیا ہی، کہ انجام کار مسلمان ہی کامیاب ہوں گے، اگرچہ کفار اپنے سامان اور تعداد کے غرور میں کتنا ہی اس سنتہ اللہ کی تکذیب کریں، مگر وہ یاد رکھیں کہ یہ فیصلہ ایک شدنی امر ہی، یہ ایک بابرکت قانون ہی، اور کوئی چیز اس کے نفاذ میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی۔

لوح محفوظ

لوح محفوظ کے متعلق مفسرین کرام کا کسی قدر اختلاف ہی، مگر حاصل سب کا یہ ہی کہ لوح محفوظ عالم روحانیات میں ایک لوح ہی جس میں اس کائنات کے متعلق تمام سنن و نوامیس الہیہ خدائے قدوس نے محفوظ کر دی ہیں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہی، غرض یہ ہی کہ اس زبردست قانون کی جو شخص بھی مخالفت کرے گا وہ تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

الطارق

(آیات، ۱۷)

تلخیص مضامین

نجوم وکواکب کے نظام کی طرف توجہ دلا کر بتایا کہ جس طرح ایک قوت ان کی نگران کار ہے ایسے ہی ہر نفس انسانی پر ایک محافظ ہے جو اس کے ایک ایک عمل پر نظر رکھتا ہے آگے چل کر نتائج اعمال پر دو قسم کی دلیلیں پیش کیں، ایک میں انسان کے کتم عدم سے وجود میں آنے سے یہ ثابت کیا کہ اسی طرح اللہ تعالے اس کو دوسری مرتبہ بھی زندگی بخش سکتا ہے، اس کے بعد بارش کی مثال بیان کرکے واضح کیا کہ ایسے ہی گل سڑ جانے کے بعد فرزند آدم کو حیات تازہ بھی بخشی جا سکتی ہے، یہ ایک طے شدہ اور یقینی بات ہے، باقی جو لوگ اسکا انکار کرتے ہیں انھیں موقع دیا جاتا ہے کہ وہ پھر اس میں غور کریں شاید یہ مسئلہ ان کی سمجھ میں آجائے۔

یوم الدین

الطارق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۱) وَالسَّمَآءِ
وَالطَّارِقِ (۲) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ
(۳) اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ (۴) اِنْ كُلُّ نَفْسٍ
لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ۔

آسمان اور رات کے وقت آنے والے کی قسم، اور تم کو کیا معلوم کہ رات کے وقت آنے والا کیا ہے، وہ تارا ہی چمکنے والا کہ کوئی متنفس نہیں جس پر نگہبان مقرر نہیں۔

ماوردی کہتے ہیں کہ طروق کے اصلی معنی دروازہ کھٹکھٹانے کے ہیں، رات کے آنیوالے کو طارق اس لیے کہتے ہیں کہ اس وقت لوگ آرام میں ہوتے ہیں، اور اس کو دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہوتی ہے، پھر ہر اس چیز کا نام طارق رکھا گیا جو شب کے وقت ظاہر ہو، نجوم و کواکب کو اس لیے طارق کہتے ہیں کہ وہ شب کے وقت طلوع کرتے ہیں، چنانچہ فراء کی یہی رائے ہے، حدیث میں ان ناگہانی حوادث سے پناہ مانگی گئی ہے جو رات کو آئیں: اعوذ بک من شر طوارق اللیل کیونکہ اس وقت ان کا تدارک مشکل سے ہوتا ہے۔

اس سورۃ میں طارق سے کیا مراد ہے، اس کی تشریح لسان الٰہی نے خود النجم الثاقب سے کردی کہ یہ وہ ستارہ ہے جو طلوع ہونے کے ساتھ ہی ظلمت کے پردوں کو چاک چاک کر دیتا ہے،

ثاقب روشن کو کہتے ہیں۔

طریق استشہاد

آسمان کو دیکھو ان گنت ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، شب کے وقت لوگوں کی راہ نمائی کا سبب بنتے ہیں، جب سے کائنات ارضی و سماوی کی تکوین ہوئی ہے، اسی وقت سے یہ بھی اپنی درخشندگی سے تمام عالم کو منور کیے ہوئے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں مصروف عمل ہے، ایک ہی طرح پر نظر آرہا ہے، اور یہ نظام ایک ہی انداز پر قائم ہے' یہ ناممکن ہے کہ ایک دوسرے کے احاطے میں گھس جائے، یا اپنے وقت سے قبل طلوع و غروب کرے: لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار کل فی فلک یسبحون (۳۶ : ۴۰) نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے، سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

اس نظام شمسی کو دیکھنے کے بعد ہر شخص اس نتیجہ پر آسانی پہنچ سکتا ہے کہ ان ستاروں سے بالا تر ایک اور نظام بھی ہے، جو ان تمام نجوم و کواکب اور ثوابت و سیارات کی حفاظت کرتا ہے، جو ان کو جکڑ بند کیے ہوئے ہے، اور کسی کو آگے پیچھے نہیں ہونے دیتا، اسی طرح تم یہ بھی یقین کرلو کہ ایک ارفع و اعلیٰ ہستی ہے جو تمام انسانوں کو ایک ہی قانون کا پابند بنائے ہوئے ہے: ولہ اسلم من فی السموٰت والارض طوعاً و کرھاً والیہ یرجعون (۳ : ۸۳) حالانکہ سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرماں بردار ہیں، اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، وہی ذات رحمٰن و رحیم ہے جو ان کے ایک ایک عمل کی نگران ہے، اور اس کو ضائع نہیں ہونے دیتی: ان علیکم لحٰفظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون، پس جس خدا کی یہ قدرت، یہ عظمت اور یہ حفاظت ہے اس کے لیے ہر جان کی نگہداشت، اسے جزا و سزا کے لیے قائم رکھنا اور قیامت کی

دن دوبارہ زندہ کرنا کونسا دشوار کام ہے۔

نفسی شہادت

(۵) فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ (۶) خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ (۷) يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ۔

تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کاہے سے پیدا ہوا ہے، وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا ہے، جو پیٹھ اور سینہ کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔

زور کے ساتھ پانی کے بہنے کو عربی میں دفق کہتے ہیں، منی بھی زور کے ساتھ عورت کے رحم میں جاتی ہے اس لیے اس کو بھی ماء دافق کہتے ہیں، چنانچہ فراء اور اخفش نے اس کے معنی مصبوب فی الرحم کے کیے ہیں، عورت کے سینہ کی ہڈی کو تریبہ کہتے ہیں، جہاں گلوبند پڑا رہتا ہے، اس کی جمع ترائب آتی ہے، یہاں ترائب سے مراد سینہ ہے جیسا کہ ابن عباس، عکرمہ، سعید بن جبیر اور قتادہ نے بیان کیا ہے۔

اگر کسی شخص کو یہ خیال ہو کہ جب ایک چیز فنا ہو کر بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہے تو اللہ تعالے اس کو کس طرح زندہ کرے گا، اسے چاہیے کہ اپنی پیدائش میں غور کرے، خود اس کا طریق تخلیق اس شبہ کو دور کردے گا، پیدا ہونے سے قبل اس کا نام و نشان بھی نہ تھا، لیکن اللہ کی کرشمہ سازی دیکھو کہ ماں باپ اپنی قوت جسمانی قائم رکھنے کی خاطر مختلف چیزیں کھاتے ہیں، اکثر لذائذ نفسانی پورا کرنے کی غرض سے مرد و عورت کا اجتماع ہوتا ہے، لیکن اندر ہی اندر خدا نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا ہے کہ دونوں کے اختلاط سے اولاد صالح پیدا ہو جاتی ہے، اگرچہ اولاد پیدا کرنا خود ایک انسان کی طاقت سے باہر ہے۔

بعث بعد الموت

(۸) إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ (۹) يَوْمَ تُبْلَى

بے شک خدا اس کے اعادے یعنی پھر پیدا کرنے پر

السَّرَائِرُ (۱۰) فَمَالَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ۔ قادر ہی جس دن دلوں کے بھید جانچے جائینگے، تو انسان کی کچھ پیش نہ چل سکے گی اور نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا۔

جو خدا انسان کو اس طریق پر پیدا کر سکتا ہی، وہ اس کی بھی قدرت رکھتا ہی کہ جب ایک شخص بالکل نیست و نابود ہو جاے تو اسے دوسری مرتبہ زندگی بخش دے، اور یہ حیات بعد الممات اس روز نوازش ہوگی جس دن ہر شخص کے تمام رموز و اسرار ظاہر ہو جائیں گے، نہ تو کوئی اندرونی قوت ان جرائم کو چھپا سکے گی، اور نہ کوئی خارجی مددگار ان کے معاصی کی پردہ پوشی کر سکے گا: یرفع لکل غادر لواء عند استہ یقال ہذہ غدرۃ فلان بن فلاں، ہر غدار کے بیٹھنے کی جگہ پر جھنڈا نصب کر کے اعلان کیا جاے گا کہ یہ شخص دنیا میں لوگوں کے ساتھ غدر کیا کرتا تھا۔

نشئہ ثانیہ

(۱۱) وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۱۲) وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۱۳) إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (۱۴) وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔ آسمان کی قسم جو مینہ برساتا ہے اور زمین کی قسم جو پھٹ جاتی ہی کہ یہ کلام حق کو باطل سے جدا کرنے والا ہی اور بیہودہ بات نہیں۔

رجع کے معنے بارش کے ہیں جیسا کہ زجاج نے بیان کیا ہی، ابن عباس بھی والسماء ذات الرجع کے معنی ذات المطر یعنی بارش والا کرتے ہیں، صدع پھٹنے کو کہتے ہیں، نباتات زمین کو پھاڑ کر نکلتی ہیں، اس لیے زمین کو ذات الصدع کہا گیا۔

آسمان سے جب بارش نازل ہوتی ہی تو زمین میں جو بیج بویا گیا تھا، اس میں زندگی کے آثار نمودار ہوتے ہیں، آخر کار زمین پھٹتی ہے اور سب طرف سبزہ زار لہلہانے لگتا ہی اسی طرح انسان کی دوبارہ زندگی کو قیاس کرو، مرنے کے بعد اس کے اجزا مٹی میں جا کر مل جاتے ہیں اور منتشر ہو جانے کی وجہ سے ہماری نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں، مگر جن قوتوں نے

اس کو پہلی بار پیدا کیا تھا وہ اب بھی اسی طرح ان متفرق اجزار کو ایک جگہ جمع کر کے انھیں زندگی دے دیں گی، جس طرح بارش پودوں کو پیدا کر دیتی ہے، اور یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں بلکہ بڑی ہی حکمت و دانائی کی بات ہے۔

مزید مہلت

(۱۵) إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا (۱۶) وَأَكِيدُ كَيْدًا (۱۷) فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا

یہ لوگ تو اپنی تدبیروں میں لگ رہے ہیں، اور ہم اپنی تدبیر کر رہے ہیں، تم کافروں کو مہلت دو بس چند روز ہی مہلت دو۔

جزائے اعمال کا مسئلہ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہے اور خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو کتب سماویہ اور سلسلۂ انبیاء و رسل سے واقف نہ ہوں اس لیے جب کبھی انہیں اس ذمہ داری اور مسئولیت کی جانب متوجہ کیا جاتا ہے، تو بچوں کی طرح اس میں شبہات پیدا کرتے ہیں اور اس کا برابر انکار کیے جاتے ہیں یہی انکا کید اور مکر ہے، جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

ہم بھی ان کی حالت سے خوب واقف ہیں اس لیے ہر ممکن طریق سے انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں مختلف قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں اور ہر زاویہ نگاہ کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں شاید یہ لوگ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں اور اس دقیق نکتہ تک ان کی عقل کی رسائی ہو سکے، اس لیے انھیں مہلت دینی چاہیے، اور عذاب میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، اگر اس پر بھی نہ مانیں تو پھر دنیا و آخرت میں ان پر عذاب کا نازل ہونا یقینی اور قطعی امر ہے۔

الاعلیٰ

(آیات، ۱۹)

تلخیص مضامین

ابتداءِ سورت میں اللہ کی صفتِ ربوبیت بیان کر کے بتایا کہ اس صفت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے سلسلۂ وحی والہام قائم کرے تاکہ جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی ارتقا بھی حاصل ہو، چنانچہ اس سلسلہ کی آخری کڑی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے، یہ الہام آخری اور دائمی ہوگا، جو آپ کی طرف کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے موجودہ حالات اور اس کے انتہائی کمالات سے خوب واقف ہے، اور اس کتابِ عزیز میں ان تمام امور کا لحاظ کیا گیا ہے، اس قرآن کو کامیاب بنانے کے لیے وہی خدا ہر قسم کی آسانی پیدا کرے گا، نبی کا فرض صرف اتنا ہوگا کہ اس کی عام اشاعت کر دے، البتہ اس سے فائدہ وہی حاصل کرے گا جو عاقبت اندیش اور دور بین ہوگا۔

اس کے بعد کامیابی اور خسران کے اصول وکلیات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ انسان اس قدر کوتاہ بین واقع ہوا ہے کہ وہ دنیاوی فوائد کو آخرۃ کے دائمی ثمرات ونتائج پر ترجیح دیتا ہے، اور یہ غلط ہے۔ آخر میں رسول اللہ کے الہامات کی نسبت بیان کیا کہ اس قرآن میں جن عقائد و یقینیات، اور اصول اساسی پر بحث کی گئی ہے، ان پر تمام مذاہب و ادیان متفق ہیں، ہر الہامی کتاب نے ان ہی کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا، اس لیے اب دنیا کا اجتماع بھی صرف قرآن ہی پر ہو سکتا ہے، جو ان سب کا جامع ہے، اور اسی پر سورت کو ختم کر دیا۔

ضرورت الہام

الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (۱) سبّح اسم ربّک الاعلیٰ (۲) الذی خلق فسوّیٰ (۳) والذی قدّر فہدیٰ۔

اے پیغمبر! اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو، جس نے انسان کو بنایا، پھر اس کے اعضا کو درست کیا، اور جس نے اس کا اندازہ ٹھہرایا، پھر اُس کو رستہ بتایا۔

اس ربّ بزرگ کی تسبیح و تقدیس بیان کر جس کی بعض صفات ربوبیت حسب ذیل ہیں:

(الف) خلق، عدم محض سے اس نے زمین و آسمان کو ہماری ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے پیدا کیا، بدیع السموٰت والارض میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور خلق الانسان من علق بھی اسی تخلیق کی ایک جزئی ہے۔

(ب) تسویہ، لغت میں اس کے معنی برابر کرنے کے آتے ہیں گویا ایک چیز کی ظاہری و باطنی قوتوں کو اس طریق سے اس میں ودیعت کرنا اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو ایک دوسرے سے اس انداز کے ساتھ ملانا کہ ان میں کمال درجہ کی موزونیت پیدا ہو جائے: ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت؛ فارجع البصر ہل تریٰ من فطور، ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً وہو حسیر (۶۷: ۳ و ۴) کیا تو خدائے رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؛ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ، بھلا تجھ کو آسمان میں

کوئی شگاف نظر آتا ہی، پھر دوبارہ سہ بارہ نظر کر، تو نظر ہر بار تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئیگی۔

(ج) تقدیر، جب اللہ تعالے نے ہر چیز میں قوتیں رکھ دیں، تو ضروری تھا کہ ان کے اعمال و وظائف کی نوعیت، اور دائرہ و میدان عمل کا تعین ہوتا ورنہ تسویہ کا عمل رائگاں جاتا، اعمال کی نوعیت مقرر کرنا ہی تقدیر ہے: والشمس تجری لمستقر لہا ذلک تقدیر العزیز العلیم والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم، لا الشمس ینبغی لہا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار وکل فی فلک یسبحون (۳۶: ۳۸ تا ۴۰) اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہی، یہ خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہی، اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہی، نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہی کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہی، سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

(د) ہدایت، ان مدارج ثلثہ کے بعد اس بات کی ضرورت ہی کہ موافق اسباب فراہم ہوں، اور مشکلات و موانع کو دور کیا جائے، غرض یہ کہ عمل کا اجرا اور بقا و قیام، اعمال کی بارآوری اور نتائج کا ظہور سب ہدایت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

اعتبار

رب کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشو و نما دینا تا آنکہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے پس جب رب العالمین کے یہ کارنامے ہوں، تو یقیناً وہ اس امر کا مستحق ہی کہ ہر وقت اسی کی حمد و ستائش کی جائے، اور یہ کہ سب تعریفیں عمدہ سے عمدہ اول سے آخر تک جو ہوئی ہیں اور جو ہوں گی اسی خدا ہی کو لائق ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی اس سورت کی تلاوت کرتے تو سبح اسم ربک الاعلیٰ کے بعد سبحان ربی الاعلیٰ فرماتے، بخاری میں ہے کہ آپ عید کی نماز میں سورۂ اعلے اور غاشیہ پڑھا کرتے، اور اگر جمعہ اور عید کا ایک ہی

دن میں اجتماع ہوجاتا، تو دونوں نمازوں میں یہی دو سورتیں تلاوت کرتے۔

مسند امام احمد میں ہے: لما نزلت فسبح باسم ربک العظیم، قال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجعلوھا فی رکوعکم، فلما نزلت سبح اسم ربک الاعلیٰ قال اجعلوھا فی سجودکم، جب فسبح باسم ربک العظیم کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ نے فرمایا اس کو رکوع میں سبحان ربی العظیم کی صورت میں ادا کرو، اور سبح اسم ربک الاعلیٰ پر کہا کہ تم سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا کرو۔

حیوانات کی نگہداشت

(۴) وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی (۵) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی۔

اور جس نے چارہ اگایا، پھر سب کو سیاہ رنگ کا کوڑا کردیا۔

غثاء خشک چیز کو کہتے ہیں، جب گھاس خشک ہوجاتی ہے، تو سبزی کی جگہ اس پر سیاہی چھا جاتی ہے اس کا نام احوی ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا وہ پہلو بیان کیا گیا ہے جو حیوانات سے تعلق رکھتا ہے، سب سے پہلے خدا نے مختلف چیزوں کو پیدا کیا، پھر ان کی ضروریات ولوازمات پورا کرنے کے لیے دنیا میں اسباب ووسائل فراہم کردیے، نباتات میں چلنے کی طاقت نہ تھی تو انھیں جڑیں دی گئیں، مگر جانور چل پھر سکتے تھے، ان کے لیے چراگاہ بنا دیے کہ موسم بہار میں تروتازہ گھاس کھائیں، جب خزاں کا موسم آتا ہے تو اسی گھاس کو خشک سیاہ رنگ کا کردیتا ہے، جو ان کے لیے زندگی بخش ثابت ہوتی ہے اور انھیں توانائی بخشتی ہے۔

وحی والہام

(۶) سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی (۷) اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (۸) اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ

ہم تمھیں پڑھا دیں گے کہ تم فراموش نہ کروگے، مگر جو خدا چاہے، وہ کھلی بات کو بھی جانتا ہے، اور

وَمَا یَخْفٰی۔ چھپی کو بھی۔

جس خدا نے انسانوں اور حیوانوں کی سابقہ ضروریات انجام دی ہیں، اسی کی ربوبیت کا یہ بھی اقتضا ہے کہ انسان کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت کا بھی ایک نظام صالح قائم کرے، چنانچہ وہ تمھیں اے محمدؐ ان تمام سنن و نوامیس کی تعلیم دے گا جو جملہ اقوام و امم کے نشو و ارتقا کے لیے ضروری ہوں گی، اور تمھیں قرآن پڑھائے گا جس کا ایک ایک حرف تمہارے سینہ میں محفوظ رہے گا۔

الا ماشاء اللہ

اس کی شرح میں علمائے کرام مختلف الرائے ہیں، فراء یہ کہتا ہے کہ یہ الفاظ صرف یمن و برکت کی غرض سے ذکر کیے گئے ہیں، ورنہ نسیان کلی رسول اللہ پر کبھی بھی طاری نہیں ہوا، نماز میں جو دو ایک مرتبہ آپ بعض آیات کو بھول گئے، تو وہ صرف عارضی طور پر تھا اور دوسرے صحابہ کے یاد دلانے سے آپ کو وہ آیات یاد آگئیں اسی قسم کی آیت جنت میں داخل ہونے والوں کے لیے بھی آئی ہے: خالدین فیہا ما دامت السمٰوٰت والارض الا ماشاء ربک اور اس قسم کے الفاظ ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ اور دوسرے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ سب کچھ محض اللہ کی بخشش و عطا اور لطف و کرم کے نتائج ہیں، ورنہ کوئی شخص اپنے استحقاق کی بنا پر ذرہ برابر بھی طلب کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

حسن اور قتادہ کی رائے ہے کہ اس میں ان آیات کی طرف اشارہ ہے جو منسوخ الحکم و التلاوت ہیں، چنانچہ علامہ زمخشری فرماتے ہیں: جعل النسیان علیہ بمعنی رفع الحکم و التلاوۃ، بعض اس کو قلت کی طرف مشیر سمجھتے ہیں، مگر ہمارے خیال میں فراء کی رائے سب سے زیادہ قابل ترجیح ہے۔

جہر و خفی

خدائے قدوس اس قرآن کو کیسے بھول جانے دے گا، وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، وہ علیم بذات الصدور ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں کی استعداد علمی و عملی اس وقت کس قدر ہے، اور قیامت تک ان کا نشو و ارتقا کہاں تک ہوگا، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تمام سابقہ تعلیمات مٹ چکی ہیں، اور کسی الہامی کتاب کے کسی حصّہ کے متعلق بھی یقین و اذعان کے ساتھ یہ دعوی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خدا کے الفاظ ہیں، ان حالات میں قرآن کی حفظ و صیانت بدرجۂ اولے لازمی وضروری ہے، کہ یہی آخری الہام ہے، اسی پر الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا کی مہر ثبت ہے، اور اسی کی شان میں انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون نازل ہوا ہے۔

باہمی تطبیق

گذشتہ آیات میں حیوانات کی ربوبیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ موسم بہار میں تر و تازہ گھاس ان کے کام آتی ہے، اور خزاں میں وہی خشک ہو کر ان کے لیے زندگی بخش ثابت ہوتی ہے۔

بالکل یہی حال نبوت کا ہے، دنیا کے لیے بہترین وقت وہ ہوتا ہے، جب خود نبی اس میں جلوہ فرو ز ہو، اس کی وفات کے بعد اس کے حواری اور اصحاب اس کی بشارت کو دور و نزدیک پہنچا دیتے ہیں، جو اگرچہ کسی حیثیت سے بھی نبی کے مراتب عالیہ تک رسائی نہیں حاصل کر سکتے مگر لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہوتے ہیں، اور ان کی معرفت دنیا کو امن و اطمینان قلب اور حیات دائمی نصیب ہوتی ہے، اسی کو حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے: خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم، دوسری حدیث میں اس طرح آتا ہے: اصحابی کالنجوم بأیہم اقتدیتم اھتدیتم، اور اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر بھی اسی قبیل سے ہے۔

تبلیغ قرآن

(٨) وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (٩) فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (١٠) سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى (١١) وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى (١٢) الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (١٣) ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى۔

ہم تم کو آسان طریقے کی توفیق دیں گے، سو جہاں تک نصیحت کے نافع ہونے کی امید ہو نصیحت کرتے رہو، جو خوف رکھتا ہے، وہ تو نصیحت پکڑے گا اور بے خوف بدبخت پہلو تہی کرے گا، جو قیامت کو بڑی تیز آگ میں داخل ہوگا، پھر وہاں نہ مرے گا نہ جیے گا۔

اللہ نے اپنے رسول کو ایسی قوم میں نبی بنا کر بھیجا جو صدیوں سے مذہب و قانون کے نام سے ناآشنائے محض تھی، اور جو امّیوں کے نام سے پکاری جاتی تھی، ترقی ہمیشہ تدریجی ہوا کرتی ہے اس لیے قرآن حکیم مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا جس سے ایک طرف تو یہ آسانی ہو گئی کہ لوگوں کو اس کتاب عزیز کے حفظ کرنے میں بے انتہا سہولت و آسانی ہو گئی اور دوسری طرف صحابہ کرام اس کے احکام و اوامر پر عمل کرتے کرتے سعادت و کامرانی کے اعلیٰ ترین مراتب پر پہنچ گئے، اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں سہولت پیدا ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ [illegible] تمام [illegible] اقوام کی ضروریات دینی و دنیوی کا ذمہ دار و کفیل اور [illegible] ہم کو اس کی [illegible] اور ترقی [illegible] بھی ایسی ہو جہاں قرآن اور اس کے تراجم موجود نہ ہوں، چنانچہ اس آیت میں آپ اور آپ کے متبعین کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اس کی تبلیغ و اشاعت میں [illegible] کوشش کریں۔

ہمارا فرض [illegible] ہر شخص کو قرآن [illegible] دیں، اور اس کے شبہات [illegible] کر دیں [illegible] گا، جو انفرادی و اجتماعی

مصائب والام سے خوف زدہ ہوگا، اور جس نے بدعملی وبدکرداری کی راہ اختیار کی وہ کبھی اسکی طرف متوجہ نہ ہوگا، مگر یہ انحراف واجتناب اس کے حق میں مفید نہ ہوگا، بلکہ اس کو یہی آگ میں داخل کرے گا، جس میں نہ زندگی ہے نہ موت،

راہِ نجات

(۱۴) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۱۵) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (۱۶) بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۱۷) وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى	بے شک مراد کو وہ پہنچ گیا جو پاک ہوا، اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا، مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو، حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

دنیا میں انسانی اعمال گو مختلف ہوں، مگر اللہ کی نظر میں وہی کامیاب ہے جو بُرے کاموں سے الگ رہ کر تزکیۂ نفس کی راہ اختیار کرتا ہے، اور اپنے خالق سے صحیح رشتہ قائم کر کے تمام زندگی کلمۂ حق کی نشر واشاعت میں صرف کر دیتا ہے۔

مگر انسان کی بھی عجیب حالت ہے، اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے وہ دنیا کے چند روزہ عیش و کامرانی کو حیاۃ جاودانی پر ترجیح دیتا ہے، اگر وہ ذرا غور سے کام لیتا تو اسے معلوم ہوجاتا کہ دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے، دوام صرف جنت ہی کی ہر چیز کو حاصل ہے۔

دینِ قیّم۔

(۱۸) اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (۱۹) صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى۔	یہی بات پہلے صحیفوں میں مرقوم ہے، یعنی ابراہیم اور موسٰی کے صحیفوں میں۔

قرآن جن اصول وعقائد کی تعلیم دیتا ہے، وہی ابراہیمؑ وموسیٰؑ، نوحؑ وعیسیٰؑ، اور داؤدؑ وسلیمانؑ کی نبوت کے اصول اساسی تھے، تمام آسمانی کتابیں ان امور پر متفق ہیں، اور یہی کلیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، تمام مذاہب و ادیان نے ان اصول حقہ کو فراموش کر دیا ہے، جن پر ان کے مذہب کا دار و مدار تھا، قرآن انھیں یاد دلاتا ہے، اور اس عالم گیر برادری کی طرف بلاتا ہے جس کے لیے دنیا کا ہر تعلیم یافتہ آج بے قرار نظر آرہا ہے، مگر اس مشکل کا حل صرف قرآن کے اتباع میں ہے، اس لیے کہ یہ ان امور کی طرف بلاتا ہے جن پر تمام مذاہب متفق ہیں۔



غاشیہ

(آیات ، ۲۶)

تلخیص مضامین

۱۶ آیات تک کفار و مومنین کے نتائج اعمال پر بحث کی، آیت ۱۷ تا ۲۰ تک ان خصوصیات کو بیان کیا جن پر قوموں کی فضیلت و برتری اور آخرۃ میں فوز و کامرانی موقوف ہی، رسولؐ کا کام صرف اتنا ہی کہ لوگوں کو ان حقائق عالیہ کی طرف متوجہ کردے، اس کے بعد ہر شخص اپنے لیے راہ عمل معین کرنے میں آزاد ہی، مگر اس آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ اب اس سے بازپرس بھی نہ ہوگی، قیامت کے روز ان سے پورا پورا حساب لیا جائے گا، اس لیے کہ جا کہاں سکتے ہیں آخر لوٹ کر ہماری ہی طرف تو آنا ہی۔



اصول کامرانی

ناکام لوگ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) ھَلۡ
اَتٰکَ حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَۃِ (۲) وُجُوۡہٌ
یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَۃٌ (۳) عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ
(۴) تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَۃً (۵) تُسۡقٰی
مِنۡ عَیۡنٍ اٰنِیَۃٍ (۶) لَیۡسَ لَھُمۡ طَعَامٌ
اِلَّا مِنۡ ضَرِیۡعٍ (۷) لَّا یُسۡمِنُ وَلَا یُغۡنِیۡ
مِنۡ جُوۡعٍ۔

بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی یعنی قیامت کا حال معلوم ہوا ہے اس روز بہت سے مونھ والے ذلیل ہوں گے سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے، دھکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے، ایک کھولتے ہوئے چشمے کا ان کو پانی پلایا جائے گا، اور خار دار جھاڑ کے سوا انکے لئے کوئی کھانا نہیں ہوگا، جو نہ فربہی لائے اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے

غاشیہ اس چیز کو کہتے ہیں جو چاروں طرف سے کسی کو گھیر لے، قیامت تمام مخلوق کو سب طرف سے احاطہ کرلے گی، اس لیے اسے غاشیہ کہا گیا، ناصبہ مشتق ہے نصب سے اس کے معنی مشقت سے تھک کر چور چور ہو جانے کے ہیں، انیۃ، گرم کھولتا ہوا چشمہ جس کی گرمی انتہا کو پہنچ گئی ہو، ضریع ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے، جب تک ترہی اس کو شبرق کہتے ہیں، اور اونٹ اسے کھاتا ہے، جب خشک ہو جائے تو اس کے کانٹے بن جاتے ہیں، اور زہریلی ہو جاتی ہے پھر اونٹ

اس کے قریب بھی نہیں جاتا۔

ان آیات میں کفار کے نتائج اعمال بیان کیے گئے ہیں، جو دنیا میں اگرچہ محنت و مشقت کرتے رہے مگر انجام کار انکی تمام کوششیں اکارت گئیں: قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا، الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا، (۱۸: ۱۰۳ و ۱۰۴) کہدو کہ ہم تمھیں بتائیں جو عملوں کے لحاظ سے بڑے نقصان میں ہیں، وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی، اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔

ارباب ایمان

(۸) وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ (۹) لِّسَعْيِهَا	اور بہت سے مونھ والے اس روز شادماں ہوں گے
رَاضِيَةٌ (۱۰) فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (۱۱) لَّا	اپنے اعمال کی جزا سے خوش دل، بہشت بریں میں، وہاں
تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً (۱۲) فِيهَا عَيْنٌ	کسی طرح کی بکواس نہ سنیں گے، اس میں چشمے بہ رہے
جَارِيَةٌ (۱۳) فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ	ہوں گے، وہاں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے،
(۱۴) وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ (۱۵) وَّنَمَارِقُ	اور آبخورے قرینے سے رکھے ہوئے، اور گاؤ تکیے قطار
مَصْفُوفَةٌ (۱۶) وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ۔	کی قطار لگے ہوئے اور نفیس فرش بچھے ہوئے۔

نمارق جمع ہے نمرقۃ کی، اس کے معنی تکیہ کے ہیں، زرابی عمدہ بچھونے اور نفیس فرش کو کہتے ہیں، اس کا واحد زربیّۃ ہے۔

ان آیات میں ارباب ایمان کے نتائج اعمال ذکر کیے گئے ہیں، یہ اگرچہ نعمتوں سے مالا مال ہوں گے، مگر کیا مجال کہ ان کی زبان سے کوئی بات خلاف تہذیب بھی نکل جائے سورۂ مریم میں آتا ہے: لا یسمعون فیھا لغوا الا سلما (۱۹: ۶۲) وہ اس میں سلام کے سوا کوئی بیہودہ کلام نہ سنیں گے ایک جگہ یوں ارشاد ہوا: لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما الا قیلا سلما سلما (۵۶: ۲۵ و ۲۶) وہاں

نہ بیہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ، ہاں ان کا کلام سلام سلام ہوگا۔

دنیا کا عام دستور یہ ہے کہ جو لوگ عزت و مرتبت اور دولت و ثروت کے مراتب عالیہ پر فائز ہوتے ہیں، اور تمام لوگ ان کو اکرام و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں عموماً ان کی مجالس فحش و منہیات کا مرکز بن جاتی ہیں، تمسخر و استہزا، سب و شتم، اور لغو و مہمل بکواس ان کی صحبتوں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے مگر اہل جنت ان تمام بیہودہ حرکات سے پاک ہوں گے اور وقار و سنجیدگی ان کی مجالس پر برستی ہوگی۔

طبع انسانی کا خاصہ

گذشتہ سطروں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسانی عمل کا کوئی حصہ بھی ضائع نہیں جاتا، اور دنیا و آخرت میں اس کا نتیجہ ضرور مل کر رہتا ہے، جب یہ ایک ثابت شدہ مسئلہ ہے تو پھر وہ اپنے اندر ان اوصاف کو کیوں نہیں پیدا کرتا جو اس کو ہر زندگی میں کامیاب کریں اور وہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱۷) اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۱۸) وَاِلَى السَّمَاۤءِ كَيْفَ رُفِعَتْ (۱۹) وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ (۲۰) وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ۔

کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب پیدا کیے گئے ہیں، اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح گاڑے گئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔

انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ باہر سے متاثر ہوتی ہے، مگر اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ روزمرہ ایک چیز کو دیکھتی ہے، اور اس سے عبرت اندوز نہیں ہوتی: یمرون علیها وهم عنها معرضون، اس لیے قرآن کریم انہیں چیزوں کو بار بار ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ کبھی تو ہم

ان سے سبق اندوز ہوں گے' حضرت ابراہیم علیہ السّلام روزمرّہ یہی ستارے' چاند' اور سورج
دیکھتے مگر ان کے دل میں کبھی کوئی خاص کیفیت نہیں پیدا ہوتی تھی' اور پھر یہی نجوم و کواکب
تھے' جن کو دیکھ کر وہ توحید باری کے قائل ہوئے' اور پکار اٹھے : یقوم انی بری مما تشرکون'
انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین (۶ : ۷۸ و ۷۹) لوگو
جن چیزوں کو تم خدا کا شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں' میں نے سب سے یک سو ہو کر
اپنے تئیں اسی ذات کی طرف متوجہ کیا' جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے' اور میں مشرکوں
میں سے نہیں ہوں۔

سادگی طبع

یہی چاند اور سورج ہیں' نجوم و کواکب ہیں' ثوابت و سیارات ہیں' لیل و نہار ہیں'
دریا اور پہاڑ ہیں' جن کی طرف اللہ تعالیٰ انسان کو توجہ دلاتا ہے' کہ وہ ان سے نتائج و عبر
حاصل کرے'

قرآن نے ان آیات میں صرف وہی چیزیں ذکر کی ہیں' جن کے دیکھنے کے ہم یوم ولادت
سے عادی ہیں' یہی اونٹ ہے جو اس قدر اطاعت شعار ہے کہ ایک بچہ بھی اس کو جہاں
چاہے لے جا سکتا ہے' اس پر بوجھ لاد سکتا ہے' وہ جنگل کی جھاڑیاں کھاتا اور ایک مرتبہ پانی
پی کر کئی روز تک اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اب دیکھو یہ جانور اپنے مالک کے لیے کس قدر تکلیف و مصیبت برداشت کرتا ہے' اسکے
لیے یکسر اطاعت و انقیاد بن جاتا ہے' اور باوجود اس کے خود اس کی ضروریات زندگی کس قدر
مختصر اور سادہ ہیں' جنگل کی جھاڑیاں اور کانٹے اس کی غذا کے لیے کافی ہیں' اور پانی کی
یہ حالت ہے کہ ایک دفعہ پی لیا' اور دس پندرہ روز تک اس کا محتاج نہ ہوگا۔

اونٹ کی زندگی کے یہ تمام حالات ہمارے لیے سرمایۂ عبرت و بصیرت ہیں، اور ہم بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ جو شخص ملک و ملت کی خدمت کا آرزومند ہو، نوع انسانی کی ہمدردی اس کا نصب العین ہے، اور کلمۃ اللہ کی فضیلت و برتری اس کی غایۃ الغایات، تو اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اس اونٹ سے نصیحت پذیر ہو، اسی طرح ملک اور قوم کی خدمت میں جان توڑ کوشش کرے اور اپنی ضروریات حیات اس قدر سادہ اور مختصر کردے کہ دوسروں کے لیے نمونہ بن جائے۔

مبرد نے ابل سے مراد ابر کے ٹکڑے لیے ہیں، مگر یہ معنی نہ صرف ربط آیات کے لحاظ سے غلط ہیں، بلکہ تمام اہل لغت و تفسیر کے بھی خلاف ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علم الحیوانات سیکھنے کی ترغیب دی ہے۔

بلندیٔ مقصد

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیر امۃ اخرجت للناس کے لقب سے سرفراز کیا ہے، وہی شہداء علی الناس ہیں، فاستبقوا الخیرات کا حکم بھی ان ہی کو دیا گیا ہے، انھیں ہی کلمۂ حق کی نشر و اشاعت کرنی ہے، اور ہر برائی کو دنیا سے دور کرنا ہے، ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد کس قدر اہم و اعظم ہے۔

ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ ہر انسان میں موجود ہے، جب تک یہ جذبہ [illegible] ترقی ممکن نہیں اگر یہ مقصد [illegible] نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حصول مقصد کے بعد [illegible] کی ترقی [illegible] ہے اور پھر ان کا رخ تنزل کی طرف ہو جاتا ہے، حالانکہ میدان ترقی میں انسان کا قدم ہمیشہ اعلیٰ پر ہونی چاہیے [illegible] قناعت [illegible]

وقیمت اسی شخص کی ہوتی ہے جس کا مقصد نہایت ہی بلند ہو۔

مسلمانوں کو حج کرنے کا حکم دیا گیا ہے جہاں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوں گے، اور یہ وہ جگہ ہوگی جس مقام پر ہر مسلمان کے کمالات وفضائل کا اظہار ہوگا اور تمام عالم اسلامی کو معلوم ہوجائے گا کہ اس وقت دنیائے اسلام میں بہترین شخص کون ہے اس لیے حکم دیا گیا: فاستبقوا الخیرات، تم میں سے ہر ایک مسلمان طہارت وپاکیزگی اور ورع وتقویٰ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے تاکہ حج کے روز کسی کو ندامت نہ ہو۔

سورۂ تغابن میں آتا ہے: یوم یجمعکم لیوم الجمع، ذلک یوم التغابن، قیامت کے روز تمام اقوام وملل ایک میدان میں جمع ہوں گے، ہر ایک امت کا دوسری سے اخلاق وکمالات میں مقابلہ ہوگا، جس دن جو قوم بازی لے گئی، وہی فیروزمند وخوش بخت رہی، اور دوسری کو حسرت وندامت کے سوا اور کیا حاصل ہوگا، رسول اللہ نے فرمایا: انی مکاثر بکم الامم، فلا تقتلن بعدی، تمہاری کثرت تعداد کی بنا پر میں قیامت کے روز دوسری امتوں پر فخر کروں گا اس لیے ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا، ورنہ باہمی جدال وقتال اور خون ریزی سے تمہاری تعداد کم ہوجائیگی اور مجھے مسابقت اور امتیاز کا موقع نہ مل سکے گا۔

ان تمام تصریحات کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان دنیا کی تمام قوموں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں، اور ہر فرزند اسلام میں اتنی ہمت ہونی چاہیے کہ اگر موقع پڑے تو وہ تمام دنیا کا مقابلہ کرسکے، اس لیے قرآن نے دعا مانگنے کی یوں تعلیم دی: واجعلنا للمتقین اماما، تقویٰ تو ہر شخص میں ہوگا، مگر ہم اسی پر قناعت کرکے نہ بیٹھ جائیں، بلکہ ہماری نظر اتنی بلند ہو کہ ہم متقین کے امام وپیشوا بننے کی آرزو اور کوشش کریں۔

والی انسانیت رفعت میں یہی تعلیم دی گئی ہے، کہ جب ہم اپنا مقصد حیات معین کرنے کا

ارادہ کریں، تو ہماری نظر معمولی انسانوں اور ادنیٰ نمونوں کو دیکھ کر اسی جگہ نہ رُک جائے، بلکہ ہم آسمان کو دیکھیں جو کس قدر بلند ہے، اور بغیر ستونوں کے قائم ہے، اسی طرح ہمارا مقصد حیات بھی نہایت ہی بلند ہو، اور پھر اس کے کسب حصول کے لیے ہم کسی انسان پر اعتماد نہ کر بیٹھیں، بلکہ ہماری نظر صرف خدا پر ہو: ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ

اس آیت مبارکہ میں علم ہیئت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

استقلال

جس شخص کا مقصد جس قدر بلند ہوگا، اُسے تکالیف و شدائد سے بھی دوچار ہونا پڑے گا اور یہی وقت اُس کے امتحان کا ہوگا، اگر اس نے ان تمام عوائق و موانع کی پروا نہ کی، بلکہ ہر رکاوٹ کو دور کرکے آگے بڑھتا چلا گیا، اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا، تو وہ یقیناً اپنی مراد کو پالے گا، اسے صبر و تحمل استقلال و ثبات قدم، صمیم قلب اور عزم راسخ سے کام لینا پڑے گا، تب کہیں جاکر کامیابی کا مونھ دیکھے گا۔

قرآن نے بار بار ارباب ایمان کو ان جذبات حقہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان فرزندان اسلام کی مدح و ستائش کی ہے جو مصیبتوں کے وقت ثابت قدم رہتے ہیں، سورۂ بقر میں ہے: ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات، وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون، اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون، (۲: ۱۵۵ تا ۱۵۷) اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے، تو صبر کرنے والوں کو خدا کی خوشنودی کی بشارت سنا دو ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے، اور یہی سیدھے رستے پر ہیں، ایک جگہ

فرمایا: وکاین من نبی قتل معہ ربیون کثیر، فما وہنوا لما اصابہم فی سبیل اللہ، وما ضعفوا، وما استکانوا واللہ یحب الصابرین، (۳: ۱۴۶) اور بہت سے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر اکثر اہل اللہ، خدا کے دشمنوں سے لڑے ہیں، تو جو مصیبتیں ان پر راہ خدا میں واقع ہوئیں ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری، اور نہ بزدلی کی، نہ کافروں سے دبے، اور خدا استقلال رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

پہاڑوں کو دیکھئے، آندھیاں چلتی ہیں، طوفان آتے ہیں، شہروں کے شہر برباد ہو جاتے ہیں، دریا اپنا رخ بدل دیتے ہیں، حکومتوں میں انقلابات رونما ہوتے ہیں، قومیں صفحۂ دنیا سے ناپید ہو جاتی ہیں، مگر پہاڑ ہیں کہ اپنی جگہ پر قائم ہیں، اور ایک رخ بھی وہاں سے نہیں ہٹتے، پس جو شخص اعلیٰ ترین مقاصد لے کر دنیا میں آیا ہو، وہ ان پہاڑوں سے ثابت قدمی کا سبق سیکھے اور اس طرح گڑ جائے کہ کوئی چیز بھی اس کے پائے استقامت میں تزلزل نہ پیدا کر سکے، اس کے بعد کامیابی ہی کامیابی ہے۔

علم جبال سیکھنے کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

فروتنی

جو لوگ بے انتہا قربانیوں کے بعد ان اعلیٰ ترین مقاصد میں کامیاب ہوں، تو ردعمل اور ری ایکشن کے طور پر ان میں جذبۂ انتقام پیدا ہو جاتا ہے، اور ان لوگوں پر ظلم و ستم کرنا شروع کر دیتے ہیں جنہوں نے ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی تھی، اور اس میں وہ بسا اوقات بے گناہوں کو بھی تباہ و برباد کر دیتے ہیں ہنگامۂ [illegible] کی مثال ہمارے سامنے ہے، جب انگریزوں کو ہندوستانیوں پر کامیابی ہوئی، تو انھوں نے کس طرح ہزاروں لاکھوں بے گناہ لوگوں کو بے خانماں برباد کیا، لارڈ کچنر کو فتح سوڈان سے اطمینان نہ ہوا، ور صلح عظیم حضرت مہدی علیہ الرحمۃ

ولعفران کی لاش بھی اس فرعون مصر کے ظلم وستم سے نہ بچ سکی۔

مگر انسانیت اعلیٰ کا معلم قرآن کہتا ہے کہ اس وقت تم زمین سے عبرت پذیر ہو، لوگ اس کی پشت پر ہر قسم کی ناشائستہ حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں، اس پر بول و براز کرتے ہیں، مگر پھر بھی وہی زمین تمہارے سامنے عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرتی ہے، تم سے کوئی انتقام نہیں لیتی، پس تم بھی اپنی فتح وکامرانی کے بعد زمین کی طرح عاجز بن جاؤ اور اپنے مخالفین کے سامنے فروتنی کا اظہار کرو۔

علم طبقات الارض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

ایک مثال

اگر ان صفات حسنہ سے متصف کسی نمونہ کے طالب ہو تو رسول اللہ اور آپ کے صحابہ کو دیکھو جو سادہ معیشت اور اعلیٰ تخیل کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فاتحانہ حیثیت سے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، آپ کے شدید ترین دشمن آپ کے سامنے آتے ہیں جن کو آپ بآسانی قتل کر سکتے ہیں، مگر آپ العفو اقرب للتقویٰ کے مطابق انتم الطلقا فرما کر سب کو آزاد کر دیتے ہیں۔

حضرت علی اپنے دشمن پر قابو پا چکے ہیں، اس کی گردن اپنی تلوار سے اڑا سکتے ہیں کہ اتنے میں وہ آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیتا ہے، آپ فوراً اس کی چھاتی سے اتر آتے ہیں کہ دنیا کے سامنے عمل کے لیے ایک صحیح نمونہ پیش کریں، یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے، ورنہ رسول اللہ اور آپ کے دوستوں کی زندگی تو اس قسم کے امثلہ و نظائر سے پُر ہے، اور یہی لوگ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔

فرض تبلیغ

(۲۱) فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ (۲۲) لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۲۳) إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ (۲۴) فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ (۲۵) إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ (۲۶) ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ۔

تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنیوالے ہی ہو، ان پر داروغہ نہیں ہو، ہاں جس نے مونھ پھیرا، اور نہ مانا، تو خدا اس کو بڑا عذاب دے گا، بیشک ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہی، پھر ہمیں ان سے حساب لینا ہی۔

یہ کائنات ارضی وسماوی تمہارے سامنے ہی، جو بانگ دھل تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہے، کہ تم اس سے عبرت اندوز وبصیرت افروز ہو رسول اللہ کا کام صرف اتنا ہی کہ تمہاری غفلت کے پردوں کو چاک چاک کر دے، ان حقائق ومعارف کی طرف تمہیں توجہ دلا دے جو لازمہ حیات ہیں اور جن پہ تمہاری انفرادی اور اجتماعی کامیابی کا دارومدار ہی، راہ حق دکھانے کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے، اس سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ اس کی تعلیم سے تم ہدایت یافتہ کیوں نہیں ہو گئے، اس کا فرض صرف تبلیغ تھا، اور وہ اس نے ادا کر دیا: وما انت علیھم بجبار، فذکر بالقرآن من یخاف وعید، (۵۰ : ۴۵) اور تم انپر زبردستی کرنے والے نہیں ہو، پس جو ہمارے عذاب کے وعدے سے ڈرے اس کو قرآن سے نصیحت کرتے رہو۔

باوجود اس تذکیر وموعظت کے جو لوگ اس تعلیم سے احتراز کریں گے، اور انکار وجحود کی زندگی بسر کریں گے، بتدریج ان کی تمام قوتوں پہ عالم ممات طاری ہو جائے گا، اور عذاب اکبر میں مبتلا ہوں گے، ان سب کو آخر ہمارے ہی دربار میں آکے وزحاضر ہونا ہی، پھر ہم ان سے ایک ایک چیز کا حساب لے لیں گے۔

الفجر

(آیات، ۳۰)

تلخیص مضامین

اس سورۃ میں جزائے اعمال پر بحث کی گئی ہے، ابتدا میں چار شہادتیں پیش کیں، آیت ۱-۱۴ تک بتایا کہ قومیں جو دنیا میں برباد ہوتی ہیں تو وہ قانون جزائے اعمال کے تحت میں برباد ہوتی ہیں، آیت ۱۵-۲۰ تک انفرادی جزا و سزا کا تذکرہ کیا اور پھر آخر سورہ تک اس مضمون کو واضح کیا کہ جس طرح دنیا میں اجتماعی اور انفرادی طور پر سزا ملتی ہے ویسے ہی مرنے کے بعد بھی عقاب و ثواب اور پھر جنت و دوزخ کا سلسلہ قائم ہوگا اور اسی پر سورۃ کو ختم کر دیا۔



جزائے اعمال

اقسام کی تفصیل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) وَالْفَجْرِ (۲) وَلَیَالٍ عَشْرٍ (۳) وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۴) وَاللَّیْلِ اِذَا یَسْرِ (۵) هَلْ فِیْ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ۔

فجر کی قسم، اور دس راتوں کی، اور جفت اور طاق کی، اور رات کی جب جانے لگے، بے شک یہ چیزیں عقلمندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق ہیں کہ کافروں کو ضرور عذاب ہوگا۔

مفسرین کرام نے ان اقسام کی شرح و تفصیل میں اختلاف کیا ہے، علی، ابن عباس، مجاہد، عکرمہ اور سدی کے نزدیک ہر روز کی صبح مراد ہے، مسروق اور محمد بن کعب کی رائے میں یہ یوم النحر کی فجر ہے، قتادہ کے نزدیک محرم کی پہلی تاریخ ہے، ضحاک کی رائے ہے کہ یہ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ ہے بعض نے ان قرآن الفجر کان مشہودا کی بنا پر اس سے نماز فجر مراد لی ہے دوسرے لوگوں نے وجعلنا من الماء کل شئ حی کی وجہ سے فجر کے معنی چشمہ کے بیان کئے ہیں۔

فجر کے بعد لیالی عشر کے متعلق بھی وہی اختلاف آرا ہے کہ یہ کونسی دس راتیں ہیں ایک جماعت رمضان کی آخری دس راتیں کہتی ہے دوسرا گروہ محرم کی ابتدائی دس راتیں لیتا ہے، ایک طائفہ نے ذرا تفصیل سے کام لیا ہے، انہوں نے ان دس راتوں کو سال کے مختلف حصول

میں تقسیم کردیا ہے، ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹، لیلۃ القدر کی راتیں، عید الفطر کی رات، یوم النحر کی رات، ۲۷ رجب کی شب، ایک شب برات اور عرفہ کی رات، ایک قول یہ ہے کہ ذی الحجہ کی پہلی دس راتیں ہیں۔

ہماری رائے

یہ مختلف اقوال ہیں، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں سے مراد ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں، احادیث میں کثرت سے ان کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، بخاری نے ابن عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے: مامن ایام العمل الصالح احب الی اللّٰہ فیہن العمل من ہذہ الایام یعنی عشر ذی الحجۃ، قالوا ولا الجہاد فی سبیل اللّٰہ، قال ولا الجہاد فی سبیل اللّٰہ الا رجلا خرج بنفسہ ومالہ، ثم لم یرجع من ذلک بشئ، سال کے تمام دنوں میں سے ذی الحجہ کے ابتدائی دس ایام میں جو عمل صالح کیا جاتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ پسند کرتا ہے، صحابہ نے عرض کیا کیا جہاد بھی اس کے برابر نہیں، آپ نے فرمایا کہ مساوات کی صرف ایک صورت ہے، اور وہ یہ کہ ایک شخص اس طرح اللہ کی راہ میں جنگ کرے کہ سب کچھ جان و مال قربان ہوجائے، نسائی میں ہے کہ رسول اللہ نے لیال عشر کے معنی ذی الحجہ ہی کیے ہیں، ایک روایت میں آتا ہے کہ جب ایک شخص حج سے فارغ ہوجاتا ہے تو وہ اس طرح گناہوں سے پاک و صاف ہوجاتا ہے، گویا ابھی ماں کے پیٹ سے معصوم پیدا ہوا ہے: کیوم ولدتہ امہ۔

پس فجر سے مراد دسویں ذی الحجہ کی صبح، اور لیالی عشر اسی ماہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں، ظاہر ہے کہ حاجیوں کو جو یہ ثواب ملتا ہے تو وہ ان کے سابقہ اعمال حسنہ ہی کا نتیجہ ہے حج حقیقت میں ایک کسوٹی ہے جس سے نیک و بد میں تمیز ہوجاتی ہے اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوجاتے ہیں جیسا کہ سورۂ بقرہ میں آتا ہے کہ حج کے بعد لوگ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں

فمن الناس من یقول ربنا آتنا فی الدنیا وماله فی الآخرۃ من خلاق، ومنهم من یقول ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرۃ حسنة وقنا عذاب النار، (۲: ۲۰۰ و ۲۰۱) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا سے التجا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو جو دینا ہے دنیا ہی میں عنایت کر، ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں، اور بعض ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشیو اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔

جفت اور طاق

شفع اور وتر کے متعلق امام فخر الدین رازی نے مفسرین کرام کے بیس اقوال نقل کیے ہیں، مگر حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ابن جریر طبری نے ان میں سے کسی ایک قول کو بھی اختیار نہیں کیا، ہماری رائے یہ ہے کہ جس طرح گذشتہ دونوں قسمیں انفرادی جزائے اعمال سے تعلق رکھتی تھیں، ایسے ہی والشفع والوتر واللیل اذا یسر سے استدلال کیا گیا ہے کہ اقوام وملل بھی اپنے اعمال کے نتائج سے بچ نہیں سکتیں بلکہ اسی دنیا میں ان کو اپنے کیے کا بدلہ مل جاتا ہے، قوموں کا عروج وزوال اسی قانون کا ایک شعبہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج تک کسی صاحب تفسیر نے شفع اور وتر کے وہ معنی مراد نہیں لیے جنھیں ہم ابھی بیان کریں گے، مگر ہمیں جو یہ جدید راہ عمل ان تمام حضرات سے الگ اختیار کرنی پڑی تو اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ خود ان بیس اقوال میں سے ایک رائے بھی ایسی نہیں جس سے ہمیں اطمینان قلب وثلج صدر حاصل ہو، ادھر ایک حد تک قرآن کریم سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے، اور اس سے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ سورۃ الحاقہ میں جزائے اعمال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: واما عاد فاهلكوا بريح صرصر عاتية سخرها عليهم سبع ليال وثمانية ايام حسوما فترى القوم فيها صرعى كانهم اعجاز نخل خاوية (۶۹: ۶ و ۷) رہے عاد ان کا نہایت

تیز آندھی سے ستیاناس کر دیا گیا، خدا نے اس کو سات رات اور آٹھ دن لگاتار ان پر چلائے رکھا، تو اے مخاطب، تو لوگوں کو اس میں اس طرح ڈھئے اور مرے پڑے دیکھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے۔

یہ عذاب ہی جو قوم عاد پر اس کی نافرمانی کی وجہ سے نازل کیا گیا، خود آگے چل کر اس سورۃ میں اسی قوم عاد کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے شفع اور وتر سے ہم نے قوم عاد کی یہ سات راتیں اور آٹھ دن مراد لیے ہیں۔

والیل اذا یسر

اس رات کی تفسیر میں بھی ہم سب سے الگ گئے ہیں، اور ہماری رائے میں یہ وہ رات ہے جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکلے ہیں، فرعون نے اپنا لشکر جمع کر کے ان کا دور تک تعاقب کیا، مگر بنی اسرائیل تو نجات پا گئے اور فرعون اپنی قوم سمیت غرق ہو گیا: اسر بعبادی فاضرب لہم طریقا فی البحر یبسا لا تخف درکا ولا تخشیٰ، فاتبعہم فرعون بجنودہ فغشیہم من الیم ما غشیہم، واضل فرعون قومہ وما ہدیٰ (۲۰، ۷۷ تا ۷۹) ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ، پھر ان کے لیے دریا میں لاٹھی مار کر خشک رستہ بنا دو، پھر تم کو نہ فرعون کے آ پکڑنے کا خوف ہوگا، اور نہ غرق ہونے کا ڈر، پھر فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا تو دریا کی موجوں نے ان پر چڑھ کر انھیں ڈھانک لیا یعنی ڈبو دیا، اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا اور سیدھے رستہ پر نہ ڈالا۔

عبرت و موعظت

یہ واقعات و حوادث تمہارے سامنے ہیں، تاریخ کے اوراق ان کی شرح و تفصیل سے بھرے پڑے ہیں، تم خود ان حالات سے واقف ہو، پھر کیا ان میں تمہارے لیے کوئی عبرت و

بصیرت نہیں، ایک عقلمند آدمی اگر ان میں غور کرے تو وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ نہ صرف ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے، بلکہ قومیں اور ملتیں بھی اس مسئولیت سے نہیں بچ سکتیں۔

حجر کہتے ہیں رکاوٹ کو عقل انسان کو فسق فجور اور بے حیائی سے روکتی ہے اس لیے حجر کے معنے عقل کے ہوئے اور ذی حجر عقلمند کو کہتے ہیں۔

تذکیر بایام اللہ

(٦) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے
(٧) اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (٨) الَّتِيْ	عاد کے ساتھ کیا کیا، جو ارم کہلاتے تھے اتنے
لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (٩) وَ	دراز قد کہ تمام ملک میں ایسے پیدا نہیں ہوئے
ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ	تھے، اور ثمود کے ساتھ کیا کیا، جو وادی قری میں
(١٠) وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ (١١)	پتھر تراشتے اور گھر بناتے تھے اور فرعون کے
الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ (١٢)	ساتھ کیا کیا جو خیمے اور میخیں رکھتا تھا، یہ لوگ ملکوں
فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (١٣)	میں سرکش ہو رہے تھے، اور ان میں بہت سی خرابیاں
فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ	کرتے تھے، تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا
(١٤) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ۔	کوڑا نازل کیا، بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی پانچویں پشت کے پوتے کا نام عاد ہے، پھر اس کی نسل کے تمام لوگ عاد کہلانے لگے، ان ہی کی طرف حضرت ہود علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، جب ان لوگوں نے اپنے رسول کی نافرمانی کی، تو آندھی سے ہلاک ہو گئے، اور صرف ایمان والے بچ گئے، پھر ان کی نسل چلی، اور وہ بھی عاد ہی کہلانے لگی، مگر امتیاز کے لیے ان

لوگوں کو عاد اولیٰ یا عاد ارم کہنے لگے جو عذاب سے ہلاک ہو گئے تھے، اور دوسروں کو عاد ثانیہ کا نام دیا گیا، ارم یا تو اس شہر کا نام ہے جس میں یہ جا کر بس گئے تھے یا اپنے دادا کی طرف منسوب تھے جن کا یہی نام تھا، اور اسی کی یاد میں ایک شہر بھی اسی نام سے آباد کیا تھا، عماد اس جگہ عمود کے معنے میں ہے، جس کو ستون کہتے ہیں، ان کے شہر کی عمارتوں میں ستون کثرت سے تھے، اس لیے اس کو ستونوں والا شہر فرمایا، اور اگر ذات العماد کو قوم عاد کی صفت قرار دیا جائے، تو اس وقت آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ بڑے قدآور تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام ثمود ہے، جابوا کسی چیز کے کاٹنے کو جوب کہتے ہیں، گریبان کو جیب اسی لیے کہتے ہیں کہ اسے قطع کرتے ہیں۔

اوتاد جمع وتد کی ہے، اس کے معنی میخ کے ہیں، اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ فرعون کے پاس گھوڑوں کے باندھنے کے لیے سونے اور چاندی کی میخیں تھیں، یا یہ کہ وہ مجرموں کو چومیخا کرکے سزا دیا کرتا تھا، صب کے معنی پھینکنے کے ہیں، اور سوط کوڑے کو کہتے ہیں، مرصاد وہ جگہ جہاں بیٹھ کر کسی کا انتظار کیا جائے یہ رصد سے ظرف مکان ہے۔

اہل عرب ان اقوام کے حالات سے خوب واقف ہیں، اس لیے ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی ہے، نتائج و عبر کی طرف طبیعت خود بخود منتقل ہو جائے گی، ان امتوں نے اپنے رسولوں کی نافرمانی کی، اپنی رعایا پر بے جا تشدد کیا، اور اپنی ذمہ داری مسئولیت سے ہمیشہ انکار کرتی رہیں، اس لیے ان جرائم کی پاداش میں ان سب کو ہلاک کر دیا گیا، اور اب صرف تاریخوں کے اوراق میں ان کے نام ہی نام رہ گئے ہیں۔

جب ایک قوم کسی غلطی میں مبتلا ہوتی ہے، تو اس کو اللہ تعالیٰ فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ اس کو اصلاح کا موقع دیتا ہے، جو لوگ اپنی حالت درست کر لیتے ہیں وہ بچ جاتے ہیں، اور

اگر وہ جرم و معصیت پر اور زیادہ دلیر ہو جائیں، تا آنکہ ان کا وجود امن عامہ کے لیے خطرناک بن جائے، تو اس وقت اللہ کا غضب ان پر نازل ہوتا ہے، اور ان کو یک قلم محو و باطل کر دیا جاتا ہے، یہی مطلب ہے ان ربک لبالمرصاد کا۔

انفرادی احتساب

گذشتہ آیات میں اجتماعی ذمہ داری اور جواب دہی پر بحث کی گئی تھی، اب بتایا جاتا ہے کہ اقوام و امم کی طرح افراد بھی اپنے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں، اور ہر ایک کو اسی دنیا میں اس کا بدلہ مل جاتا ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو۔

(۱۵) فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ (۱۶) وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ۔

مگر انسان عجیب مخلوق ہے کہ جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اُسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے، تو کہتا ہے کہ آہا میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی، اور جب دوسری طرح آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہائے میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا۔

دنیا میں اللہ تعالے ایک شخص کو عزت دیتا ہے، تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ نے مجھے تمام نوع انسانی پر فضیلت و برتری نوازش کی ہے، اب اُسے بالکل آزاد چھوڑ دیگا، اور اس کے اعمال فاسقہ پر کوئی مواخذہ نہ کرے گا، پس وہ طغیان و سرکشی کرتا ہے اور عذاب الٰہی سے بالکل بے خوف ہو جاتا ہے۔

پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ وہ اُسے تنگی رزق اور تکلیف و مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے، تو وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ نے مجھے ذلیل کر دیا، اس کی نظر عنایت مجھ پر نہیں رہی، اس لیے

اب میں جو عمل بد کروں، مجھ سے باز پرس نہ ہوگی، اور اگر نیکی کرونگا تو اس کا کچھ ثواب نہ ملے گا، حالانکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان مصائبُ آلام کا مقصد صرف یہ ہو کہ اس کے کمالات و فضائل کا اظہار ہو، اور وہ عیوب و نقائص سے پاک وصاف ہو جائے سچ ہے انسان بڑا ہی بے صبر واقع ہوا ہے، قرآن میں ایک جگہ آتا ہے: اِنَّ الانسان خلق ھلوعا، اذا مسہ الشر جزوعاً و اذا مسہ الخیر منوعا الا المصلین (۷۰: ۱۹ تا ۲۲) کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے، جب اُسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے، اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے، مگر نماز گذار۔

اس کا اصلی سبب

(۱۷) كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ (۱۸) وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (۱۹) وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا (۲۰) وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔

نہیں بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے، اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو، اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور مال کو بہت عزیز رکھتے ہو

تراث اصل میں وراث تھا، واو مضموم تے سے بدل لیا گیا، اس کے معنی میراث کے آتے ہیں، لم بہت جمع کرنے کو کہتے ہیں، اگر ایک لشکر میں بہت آدمی جمع ہوں تو اُس کو کتیبہ ملمومۃ کہتے ہیں، جم کے معنی کثیر کے ہیں۔

تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حصولِ دولت و راحت دنیا اللہ کی رضامندی اور اس کے اکرام و احترام کے نتائج ہیں، یا دنیاوی فقر و فاقہ اور آلام و مصائب

اس کی ناراضگی اور توہین کے آثار، بلکہ تم ان سب کا اصلی سبب دریافت کرو تو وہ خود تمہارے اپنے اعمال ہیں جن کے نتائج تمہیں مل رہے ہیں: وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم (۴۲ : ۳۰) اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے فعلوں سے، دوسری جگہ آتا ہے: ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقہم بعض الذی عملوا لعلہم یرجعون، (۳۰ : ۴۱) خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے، تاکہ خدا ان کو ان کے بعض عملوں کا مزا چکھائے عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔

خدا نے جو تمہیں دولت دی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر روپیہ تمہاری ضروریات سے بچ جائے اُسے فقرا و مساکین میں تقسیم کردو، مگر تم بخل و امساک سے کام لیتے ہو، اور بے یار و مددگار یتیم کی نگرانی بھی نہیں کر سکتے، اگر جیب سے خرچ کرنا مشکل تھا تو دوسرے شخص کو غریب و نادار کی اعانت کے لیے کہہ سکتے تھے، مگر تم سے یہ بھی نہ ہو سکا، اور تم اس قدر حریص بن گئے کہ مردوں کا مال بھی سمیٹ سمیٹ کر کھانے لگے، تو اب یہ یقین کرلو کہ ان ہی اعمال کی پاداش میں تم پر یہ شدائد و آلام نازل ہو رہے ہیں۔

آخری احتساب

یہاں تک یہ مضمون صاف ہو گیا کہ دنیا ہی میں انسانوں کو ان کے اعمال کا بدلا ملنا شروع ہو جاتا ہے، اور یہ قانون نہ صرف افراد انسانی کے لیے ہے، بلکہ اقوام و ملل بھی اس کی ہمہ گیری میں داخل ہیں، اب بتایا جاتا ہے کہ بہت سے کام ہیں جن کی سزا و جزا اس تنگ دنیا میں نہیں مل سکتی اس لیے مرنے کے بعد بھی ثواب و عقاب کا

سلسلہ جاری رہتا ہے، اور جنت و دوزخ کی تقسیم اسی کے تحت میں ہوگی:

(۲۱) کَلَّآ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا (۲۲) وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا (۲۳) وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّکْرٰی (۲۴) یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ۔

توجب زمین کی بلندی کوٹ کوٹ کر پست کردی جائے گی، اور تمہارا پروردگار جلوہ فرما ہوگا، اور فرشتے قطار باندھ کر آموجود ہوں گے، اور دوزخ اس دن حاضر کی جائے گی، تو انسان اُس دن متنبہ ہوگا، مگر تنبہ سے اسے فائدہ کہاں مل سکے گا، کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی جاودانی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا۔

دک کے معنے انہدام وکسر کے ہیں، دکا دکا یعنی ایک کے بعد دوسرا، ان آیات میں بعض حوادث قیامت ذکر کیے گئے ہیں، اُس روز زمین وآسمان کے مالک کا دربار قائم ہوگا، تمام ملائکہ صف بستہ ادب کے ساتھ کھڑے ہوں گے، دوزخ بھی حاضر کی جائیگی ان مدہش والمناک مناظر کو دیکھ کر ہر شخص عبرت پذیر ہوگا، مگر اُس وقت یہ چیز کام نہ آئے گی، کیونکہ یہ وقت ظہور نتائج کا ہوگا۔

ظہور نتائج

(۲۵) فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ (۲۶) وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ (۲۷) یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۲۸) ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (۲۹) فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ

تو اس دن نہ کوئی خدا کے عذاب کی طرح کسی کو عذاب دے گا، اور نہ کوئی ویسا جکڑنا جکڑے گا اے اطمینان پانے والی روح، اپنے پروردگا کی طرف لوٹ چل، تو اُس سے راضی، وہ تجھ سے راضی، تو میرے ممتاز بندوں میں شامل ہوجا،

(۳۰) وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ اور میری بہشت میں داخل ہوجا۔

وثاق کے معنی باندھنے کے ہیں، جس طرح اغلال و سلاسل سے مجرم کو جکڑ بند کردیتے ہیں، قرآن کریم نے نفس کے تین اقسام بیان کیے ہیں:

(۱) امارہ: ان النفس لامارۃ بالسوٓء الا ما رحم ربی (۱۲: ۵۳) کیونکہ نفس امارہ انسان کو برائی ہی سکھاتا ہے، مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے۔

(۲) لوامہ: لا اقسم بیوم القیمۃ ولا اقسم بالنفس اللوامۃ: (۷۵: ۱و۲) ہم کو روزِ قیامت کی قسم، اور نفس لوامہ کی۔

(۳) مطمئنہ: جس کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا ہے: یایتھا النفس المطمئنۃ۔

جن لوگوں نے دنیاوی زندگی فسق و فجور میں بسر کی ہوگی اس روز انھیں ایسی سزا ملے گی کہ ایسی سزا نہ دیکھی ہوگی نہ سنی، لیکن اربابِ تقویٰ و طہارت کو خاص مقربین میں شامل کیا جائے گا، اور اللہ کی جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

البلد

(آیات، ۲۰)

تلخیص مضامین

شروع میں چند قسموں کو اس دعوی کے ثبوت میں پیش کیا کہ کوئی انسان بھی راحت و آرام کی زندگی بسر نہیں کرسکتا، بلکہ ہر ایک کو ہم نے تکلیف میں پیدا کیا ہے۔ بعض لوگ موہوم راحت کے عشق میں اپنی دولت برباد کرتے ہیں، انھیں بتایا گیا کہ حقیقی آرام اس طرح نہیں ملا کرتا، بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ وہ ان اعمال کا اپنے آپ کو خوگیر بنائے جو اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں اور صبر و رحم کو بھی ہات سے نہ جانے دے تب کہیں جا کر اُسے اطمینان کامل کی زندگی نصیب ہوگی، ورنہ اس کی جگہ دوزخ ملے گی۔

پیدا کیا ہے۔

غلط مصرف

(۵) اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ (۶) یَقُوۡلُ اَہۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا (۷) اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ اَحَدٌ (۸) اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ (۹) وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ (۱۰) وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ۔

کیا وہ خیال رکھتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پائیگا کہتا ہی کہ میں نے بہت سا مال برباد کردیا کیا اسے یہ گمان ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں، بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، یہ چیزیں بھی دیں اور اس کو خیر و شر کے دونوں رستے بھی دکھا دیے۔

لبدا جمع ہے لبدۃ کی، اس کے لغوی معنی ایک کو دوسرے پر رکھنے کے ہیں، مگر اب اس سے مراد مال کثیر ہے۔ نجد اونچے مقام کو کہتے ہیں، ملک نجد کو اسی لیے نجد کہتے ہیں کہ وہ تہامہ کے مقابلہ میں بلند جگہ پر واقع ہی، ان آیات میں نجدین سے مراد خیر و شر کے دونوں راستے ہیں، جیسا کہ سورۂ دہر میں آتا ہے: انا ہدینہ السبیل اما شاکرا واما کفورا، (۷۶: ۱۳) ہم نے اسے رستہ بھی دکھا دیا، اب وہ خواہ شکر گذار رہو، خواہ ناشکرا۔

ایک شخص روز ولادت سے وفات تک تکلیف میں مبتلا ہی، مگر اس کے جہل و نادانی کی یہ حالت ہی، کہ فریب دہ آرام اور باطل راحت کے حصول میں اپنی قوت و طاقت صرف کردیتا ہی، کیا وہ اس خیال میں ہے کہ جس فاطر السموات والارض نے یہ قانون بنایا ہے وہ اسے یوں ہی آزاد چھوڑ دے گا۔

وہ دولت جمع کرتا ہے، تمام عمر اس کے کسب و حصول میں صرف کردیتا ہی۔ پھر اس کو بیجا مواقع میں خرچ کرتا ہے، ناچ اور رنگ کی صحبتیں منعقد ہوتی ہیں اسلامی حکومتوں کے

برباد کرنے، سرکاری خطابات حاصل کرنے، اور درباروں میں کرسی نشینی کے عشق میں وہ غیر مسلم حکومتوں کو چندے دیتا ہے، اور یہ گمان کرتا ہے کہ اب اس تگ و دو کے بعد خطاب یافتہ ہو جانے اور حاکم اعلیٰ کی صحبت و ہم نشینی پر مجھے حقیقی راحت مل جائے گی، پھر اس تمام بداخلاقی اور فسق و فجور کی زندگی کے بعد بھی اسے یاس و حرماں، اور ناکامی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہوتا تو پکار اٹھتا ہے کہ میں نے تو اپنی تمام دولت یوں ہی برباد کردی اور کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

بھلا کیا ایک غیر مرئی ہستی اس کی ان تمام حرکات کو نہیں دیکھ رہی تھی، وہ کس طرح اس بداخلاق کو نتائج صالحہ سے شرف اندوز کرسکتی تھی، جب کہ اس کا ہر قدم جو اٹھتا تھا تو اس میں فرزندان اسلام ہی کی تباہی و بربادی مضمر ہوتی تھی، اگر وہ اپنی جہالت و لاعلمی کا عذر کرے تو یہ مسموع نہیں، اس لیے کہ قانون سے ناواقفیت کسی عقل مند کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں، آخر آنکھیں کس لیے تھیں، اور اگر اندھا تھا تو خدا نے زبان اور دو ہونٹ نوازش کیے تھے کسی سے پوچھ لیتا، پھر نیکی اور بدی کی راہیں اس کے سامنے کشادہ تھیں، رشد و ضلالت میں تبیین کر دیا گیا تھا، سعادت و شقاوت میں کسی قسم کا اشتباہ و التباس نہ رہا تھا، دونوں میں حد فاصل قائم تھی، تم نے جو راہ اختیار کی وہ اپنی پسند اختیار سے کی، اب یہ عذر لنگ کیسا۔

اصلی راہ

اب بتایا جاتا ہے کہ وہ کون سی راہ ہے جس پر چل کر ایک انسان حقیقی راحت کے کسب و حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے:

(۱۱) فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (۱۲) وَمَا — مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گذرا۔ اور تم کیا

أَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ (۱۳) فَكُّ رَقَبَةٍ (۱۴) أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ (۱۵) يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۱۶) أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ۔

سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے، کسی کی گردن کا چھڑانا، یا بھوک کے دن کھانا کھلانا، یتیم رشتہ دار کو، یا فقیر خاکسار کو۔

اقتحام کسی سخت کام میں داخل ہونے کو کہتے ہیں، عقبہ پہاڑ کی گھاٹی، فک کے معنی دُور کرنا، اور رقبہ گردن، یہاں غلام آزاد کرنا مراد ہی، مسغبۃ مصدر ہی سغب سے لیا گیا اس کے معنی بھوک کے ہیں، مقربہ کے معنی قرابت فی النسب کے ہیں، متربہ مصدر ہے ترب یترب سے غربت و افلاس کے معنی ہیں، اس قدر حقیر ہو جانا کہ مٹی کے ساتھ مل جائے۔

فکِ رقبہ

وہ دشوار گذار راہ جس کے طے کر لینے کے بعد راحت ہی راحت ہی یہ ہے:

(الف) جن ممالک میں غلاموں کی تجارت ہوتی ہے، وہاں غلاموں کو آزاد کرنا۔

(ب) جو لوگ قرض لیکر بنیوں اور ساہوکاروں کے سود در سود میں پھنس کر غلامانہ زندگی بسر کر رہے ہیں، جو اسلامی ممالک یورپین مہاجنوں اور بینکروں کے پنجۂ ظلم میں اس قدر جکڑ بند ہو گئے ہیں کہ ان پر یورپین حکومتوں کو اقتدار و تسلط حاصل ہو گیا ہی، انھیں ان دجاجلہ و شیاطین کے قہر و استبداد سے بچانا، ان کے مکر و فریب کو واضح کرنا، اور ان کے قرضوں سے انھیں نجات دلانا۔

(ج) جو غیر مسلم اقوام اپنی آزادی کو سلب کر چکی ہیں، اور غیروں نے ان کو اپنا غلام و محکوم بنا لیا ہے، کامل آزادی اور استقلال تام کے حصول میں ان کی مدد کرنا، انھیں تعلیم دینا، اور ان کی راہ آزادی میں جس قدر رکاوٹیں ہوں اُن کو دور کرنا۔

مساکین و یتامے

غربت و افلاس اور گرانی اجناس کے ایام میں اپنے رشتہ دار یتامیٰ کی امداد و اعانت، ان کی تعلیم و تربیت، اور ان کی حفظ و نگہداشت الزم اللوازم ہے، اگر ان کی نگرانی نہ کی گئی، تو تعلیم نایافتہ افراد کی کثرت ہو گی اور وہ قوم کے لیے بار دوش ہونے کے علاوہ خود اس کی راہ ترقی میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوں گے۔

پھر تمہاری جیب اپنے ہی عزیزوں کے لیے مخصوص نہو، بلکہ تمہارے جود و عطا کو عام ہونا چاہیے، جو مسکین بھی مل جائے، اُس کی امداد کرو، اسے کھانا کھلاؤ کہ نوع انسانی کی ہمدردی ایک مسلم کا فرض اولین ہے۔

اصحٰب المیمنۃ

(۱۷) ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۱۸) أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ۔

پھر ان لوگوں میں بھی داخل ہو جو ایمان لائے اور صبر کی نصیحت اور لوگوں پر شفقت کی وصیت کرتے رہے، یہی لوگ صاحب سعادت ہیں۔

مگر ان اعمال صالحہ کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دل ایمان باللہ سے خالی نہ ہو، راہ حق و اعلائے کلمۃ اللہ میں نہ صرف ہر قسم کی تکلیف و مصیبت خود ہی برداشت کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس جذبہ حقہ کی تلقین کرے، اور آپس میں رحم و محبت، الفت و یگانگت، اور شفقت و رحمت کی وصیت کرے کہ اسی سے قوم کے اجزائے مختلفہ باہم دگر پیوست رہتے ہیں، اور حیات قومی باقی رہتی ہے۔

صرف یہ لوگ ہیں جن کو اصحاب یمن و برکت کہا جا سکتا ہے، یہی دنیا میں کامیاب ہونگے، اور انھیں کو مرنے کے بعد حقیقی راحت نصیب ہو گی، اصحٰب الیمین یعنی دائیں طرف کے لوگ،

لسان الٰہی ان اہل یمین کو سعید و خوش بخت کا لقب دیتی ہے۔

بدبخت

(۱۹) وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ (۲۰) عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ۔

اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا، وہ بدبخت ہیں، یہ لوگ آگ میں بند کر دیے جائیں گے۔

مگر جو لوگ ان صاف و صریح احکام کی نافرمانی کریں گے، آیات الٰہیہ کا انکار ان کا شیوہ بن جائے گا، تو وہی بدبخت و نامراد ہوں گے، دوزخ کے سوا اور کوئی جگہ اُن کے رہنے کی نہ ہوگی، اور انھیں دائمی راحت سے محروم کر دیا جائے گا۔

الشمس

(آیات، ۱۵)

تلخیص مضامین

ابتدائی دس آیات میں مناظر قدرت سے، اور آخری پانچ آیتوں میں ایک مشہور تاریخی واقعہ سے استدلال کر کے بتایا کہ کامیاب صرف وہ لوگ ہیں جو اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کے خوگیر ہوں، اور فاسق و فاجر کے لیے ناکامی و خسران کے سوا اور کچھ نہیں۔



کامرانی و خسران

مناظر قدرت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) وَالشَّمۡسِ وَ ضُحٰہَا (۲) وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰہَا (۳) وَالنَّہَارِ اِذَا جَلّٰہَا (۴) وَاللَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰہَا (۵) وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰہَا (۶) وَالۡاَرۡضِ وَمَا طَحٰہَا۔

سورج کی قسم اور اُس کی روشنی کی، اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے، اور دن کی جب اُسے چمکائے اور رات کی جب اُسے چھپائے اور اسمان کی، اور اُس ذات کی جس نے اسے بنایا، اور زمین کی اور اُس کی جس نے اُسے پھیلایا۔

قران کریم کا ایک اندازیہ بھی ہے کہ وہ اپنے دعاوی کے ثبوت میں مناظر فطرۃ سے استدلال کرتا ہے، ایک جگہ آیا: ومن آیاتہ اللیل والنہار والشمس والقمر، (۴۱: ۳۷) رات اور دن، سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، آل عمران میں فرمایا: ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب (۳: ۱۹۰) بیشک آسمان و زمین کی پیدائش اور اختلاف لیل و نہار میں عقل والوں کے لیے صدہا عبرتیں اور بصیرتیں ہیں، یہی چاند اور سورج ہیں، جن سے ہم کوئی سبق نہیں لیتے، مگر یہی چیزیں تھیں جن سے ابراہیم کو توحید خالص کی راہ ملی۔

ان آیات میں بھی سورج او چاند، دن اور رات، آسمان اور زمین کو اس حقیقت

ثابتہ کے لیے دلیل میں پیش کیا ہے کہ کامیاب وہی لوگ ہوں گے جو تہذیب اخلاق و تزکیہ نفس کی راہ اختیار کریں گے، اور ناکامی و خسران انکے لیے ہے جو اس سے گریز کریں۔

طریق استدلال

اس کائنات ارضی وسماوی کی زندگی کا انحصار اسی سورج اور چاند پر ہے، نہ صرف نباتات اور حیوانات، بلکہ حیات انسانی کا دارومدار بھی اسی شمس و قمر پر ہے، اشجار کی تروتازگی، شگوفوں کا کھلنا، کھیتوں کا لہلہانا، اور ابن آدم کا ایاب و ذہاب ان ہی کی حرارت و برودت کے ثمرات و نتائج ہیں، اگر یہ نہوں تو ان میں سے ایک چیز بھی زندہ نہ رہ سکے۔

یہی حال انسانوں کی حیات روحانی کا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت و رہنمائی اور فلاح وکامرانی کے لیے انبیاء ورسل مبعوث کرتا ہے، پھر ان کے حوارین وصحابہ ہیں جو لوگ ان کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں، اور ان کے مواعظ حسنہ کو آویزہ گوش بناتے ہیں، وہ ابرار و متقین کے گروہ میں داخل ہو جاتے ہیں، اور انحراف و اجتناب کی صورت میں ان کے قلوب و اذہان رات کی طرح تاریک ہو جاتے ہیں، جن میں ظلمت و اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا: فانہا لاتعمی الابصار، ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

نفس انسانی

(۷) وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (۸) فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا۔ اور انسان کی، اور اسکی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنیکی سمجھ دی۔

قرآن نے اکثر مقامات میں خود نفس انسانی کو بھی بطور شہادت کے پیش کیا ہے سورہ ذاریات میں آتا ہے: وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون، (۵۱ : ۲۰، ۲۱) اور یقین رکھنے والوں کے لیے اسی زمین میں نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہارے نفس کے اندر بھی کیا تم

نہیں دیکھتے، ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہے: سنریہم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسہم حتیٰ یتبین لہم انہ الحق (۵۳:۴۱) ہم ان کو عن قریب عالم میں بھی، اور خود ان کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح انبیائے کرام کی معرفت نیکی اور بدی کی راہ واضح کر دی ہے اسی طرح اس نے خود نفس انسانی میں ایک ذوق صحیح پیدا کر دیا ہے جس سے وہ نیکی اور بدی، خیر اور شر، اور اصلاح و فساد میں فرق و امتیاز کر سکتا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: الاثم ماحاک فی نفسک گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے، یہ ذوقی شہادت ایک فطری چیز ہے آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے، چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اسی کا نام نور ایمان ہے، اور یہی خیر و شر میں حد فاصل قائم کر سکتا ہے۔

پس جب نفس انسانی خود اس بات پر شاہد ہے کہ انسانی اعمال ضائع نہیں جاتے بلکہ ان کے نتائج ضرور نکلتے ہیں، ان خیراً فخیر وان شراً فشر، اگر اچھے کام کیے ہیں تو نتائج عمدہ نکلیں گے، اور اگر گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو دوزخ ہے، اس لیے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ راہ سعادت و کامرانی اختیار کرے۔

جواب قسم

(۹) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۱۰) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔ کہ جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا، اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارہ میں رہا۔

دَسّٰھا کی اصل دسسا ہے، اور تدسیس سے ہے جس کے معنی ایک چیز کو دوسری میں چھپانے کے ہیں یعنی وہ شخص جو عمل صالح میں شہرت حاصل نہ کرے۔

یہی آیات جواب قسم ہیں اور یہی اس سورۃ کا موضوع ہیں چنانچہ ان مناظر قدرت اور نفس انسانی کی شہادت سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ کامیابی صرف اسی شخص کو نصیب ہوگی جو قانون الٰہی کا اتباع کرے اور انبیائے کرام کی تعلیم حقہ سے منحرف کبھی فائز المرام نہیں ہوسکتا۔

تاریخی شہادت

(۱۱) کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ (۱۲) اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا (۱۳) فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا (۱۴) فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا

قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب پیغمبر کو جھٹلایا جب ان میں سے ایک نہایت بدبخت اٹھا، تو خدا کے پیغمبر صالح نے ان سے کہا کہ خدا کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری سے حذر کرو، مگر انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا اور سب کو ہلاک کرکے برابر کردیا۔

اس دعوی کے ثبوت میں اب ایک تاریخی واقعہ پیش کیا جاتا ہے، اللہ نے قوم ثمود کی اصلاح کے لیے پیغمبر صالح کو بھیجا، جب ان لوگوں نے ان سے تصدیق کے طور پر دلیل طلب کی تو قدوس حق نواز نے انھیں ایک اونٹنی نوازش کی، اور اس کے متعلق چند قیود لگا دیں، سورۂ ہود میں آتا ہے: ویا قوم ہذہ ناقۃ اللہ لکم آیۃ فذروہا تاکل فی ارض اللہ ولا تمسوہا بسوء فیاخذکم عذاب قریب (۱۱: ۶۴) اور یہ بھی کہا کہ بھائیو یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی یعنی معجزہ ہے تو اس کو چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے اور اس کو کسی طرح کی تکلیف نہ دینا ورنہ تمھیں جلد عذاب آپکڑے گا، سورۂ شعرا میں فرمایا: ہذہ ناقۃ لہا شرب ولکم شرب یوم معلوم

ولا تمسوہا بسوء فیاخذکم عذاب یوم عظیم (۲۶: ۱۵۵ و ۱۵۶) دیکھو یہ اونٹنی ہے ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری اور اس کو کوئی تکلیف نہ دینا نہیں تو تم کو سخت عذاب آ پکڑے گا۔

مگر قوم ثمود نے پیغمبر کے انذار و ترہیب کی کوئی پرواہ کی اس کے بدبخت ترین انسان نے نہ صرف اس رسول کی تکذیب کی اور اونٹنی کو مار ڈالا، بلکہ خود اس عبد صالح کو بھی مار ڈالنے کی خفیہ سازش کی: وکان فی المدینۃ تسعۃ رہط یفسدون فی الارض ولا یصلحون، قالوا تقاسموا باللہ لنبیتنہ واہلہ ثم لنقولن لولیہ ماشہدنا مہلک اہلہ وانا لصدقون (۲۷: ۴۸ و ۴۹) اور شہر میں نو شخص تھے جو ملک میں فساد کیا کرتے تھے اور اصلاح سے کام نہیں لیتے تھے، کہنے لگے کہ خدا کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کو اس پر اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے پھر اس کے وارثوں سے کہدیں گے کہ ہم تو اس کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں، اور ہم سچ کہتے ہیں۔

یہ لوگ رسول کی نافرمانی کرتے تھے، بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے تھے، انہوں نے اس کی اونٹنی کو مار ڈالا اور خود اس کے مارنے کی فکر میں تھے، مگر قوم خاموش تھی اور اس سے مستثنیٰ ہوتی تھی اس لیے نہ صرف مجرم ہی ہلاک ہوے بلکہ ساری کی ساری قوم برباد ہوگئی، اس واقعہ نے ثابت کردیا کہ جزائے اعمال یقینی ہے اور رسول کی نافرمانی کے بعد کامیابی ناممکن ہے۔

قرآن کا منصب اصلی

(۱۵) وَلَا یَخَافُ عُقْبٰہَا۔ اور اس کو ان کے بدلا لینے کا کچھ بھی ڈر نہیں۔

جب ایک قوم مجسمۂ شیطنت و ملعونیت بن جاتی ہے اور اس کا وجود عالم انسانیت کے لیے معصیت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک کردیتا ہے کہ یہی اس کی حکمت و تدبیر اور مصلحت عمومی کا اقتضا ہے اور پھر اس کی ہلاکت و بربادی پر اسے کسی قسم کا افسوس نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کا ایک اعلیٰ ترین وصف یہ ہے کہ وہ تمام کتب سابقہ کی حفظ وصیانت کرتا اور ان کی غلطیوں کو واضح کرتا ہے: وانزلنا الیک الکتب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتب ومھیمناً علیہ (۵: ۴۸) اور اے پیغمبر ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان سب پر شامل ہے، دوسری جگہ فرمایا: ان ہذا القرآن یقص علی بنی اسرائیل اکثر الذی ہم فیہ یختلفون (۲۷: ۷۶) بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر باتیں جن سے وہ اختلاف کرتے ہیں بیان کر دیتا ہے۔

بنی اسرائیل نے اپنی کتابوں میں اللہ اور اس کے رسولوں کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں جو بالکل غلط اور بے بنیاد ہیں، مثلاً خدا کی نسبت آتا ہے: اور خدا نے ساتویں دن اپنے کام کو جو کرتا تھا پورا کیا اور ساتویں دن اپنے سارے کام سے جو کرتا تھا فراغت پائی، (پیدائش ۲: ۲) طوفان نوح کے متعلق آتا ہے کہ جب طوفان تھم گیا اور نوح علیہ السلام نے مذبح پر سوختنی قربانیاں چڑھائیں تو خدا نے کہا: انسان کے لیے میں زمین پر پھر کبھی لعنت نہ کروں گا اس لیے کہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے اور جیسا کہ میں نے کیا ہے پھر سارے جانداروں کو نہ ماروں گا (پیدائش ۸: ۲۱) ان کے پہلے افترا علی اللہ کا جواب قرآن نے یوں دیا: ولقد خلقنا السموٰت والارض وما بینہما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب (۵۰: ۳۸) اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو مخلوقات ان میں ہے سب کو چھ دن میں بنا دیا اور ہم کو ذرا بھی تکان نہیں ہوا، دوسرے بہتان عظیم کا جواب ولا یخاف عقبٰہا سے دیا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت و رحمت کی بنا پر کرتا ہے، ایک قوم کی بربادی اور دوسری کا استخلاف فی الارض اسی قانون حکمت کے مطابق ہے اور اس میں حرص و طمع یا خوف و حذر کو مطلق دخل نہیں۔

اللیل

(آیات ۲۱)

تلخیص مضامین

اس سورۃ کا موضوع ان سعیکم لشتّٰی ہی، اس پر رات اور دن اور مرد و عورت سے استدلال کر کے بتایا کہ اس اختلاف اعمال میں کامیابی صرف اسی کو نصیب ہوتی ہی جو تقوی کی راہ اختیار کرتا ہی، اور جو لوگ تعلیم الٰہی کا انکار کرتے ہیں وہ ہمیشہ ناکام و نامراد رہتے ہیں اور انکی دولت بھی ان کے لیے بیکار ثابت ہوتی ہی، آیت نمبر ۲ سے اس مضمون پر روشنی ڈالی کہ انسان کے اعمال اور ان کے نتائج سے اللہ خوب واقف ہی پھر کون ہی جو اس کے احتساب سے بچ سکے، اور اس مسئولیت میں شقی اور بدبخت کے لیے آگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، البتہ کامیاب صرف اہل تقوی ہی ہوں گے۔

ان سعیکم لشتی

اختلاف اعمال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی — رات کی قسم جب دن کو چھپائے، اور دن کی قسم جب چمک

(۲) وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی (۳) وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ — اٹھے، اور اس ذات کی قسم جس نے نر اور مادہ پیدا کیے

وَالْاُنْثٰی (۴) اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی۔ — کہ تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔

تجلی کے معنی ظہور و انکشاف کے ہیں، شتی، جمع ہے شتیت کی، جس طرح مریض کی جمع مرضیٰ آتی ہے، بعد و افتراق کو کہتے ہیں۔

رات کی تاریکی جب تمام عالم پر چھا جاتی ہے، تو بعض لوگ تو ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاتے ہیں: وبالليل ہم یستغفرون، کچھ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور چوروں کی جماعت نقب زنی کے مشورے کرتی ہے، پھر یہی کیفیت دن کی ہے، ہر شخص اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے، اب تم خود انسانی خلقت کو دیکھو تو اس میں بھی مرد و عورت کے دو ممتاز گروہ نظر آئیں گے جو اپنے اپنے مالوفات و مطلوبات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں، پھر ہر ایک کا دائرۂ عمل جدا گانہ، ایک کے جسم کی ساخت ایسی ہے کہ وہ مسالک و شدائد کو آسانی سے برداشت کر سکتا ہے اور دوسرے کا وظیفہ حیات منزلی کی حفظ و نگہداشت ہے۔

ان تمام شواہد و بینات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ انسانوں کی سعی و کوشش طرح طرح کی ہے

اور ان کے اعمال میں اختلاف ہے۔

کامیاب لوگ

(۵) فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی (۶) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی (۷) فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی۔ — تو جس نے خدا کے رستے میں مال دیا اور پرہیزگاری کی اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان طریقہ کی توفیق دینگے

اللہ نے انسان کو دو قوتیں نوازش کی ہیں، ان ہی کی تکمیل پر اس کی فوز و کامرانی کا دارومدار ہے، (۱) قوت علمیہ (۲) قوت نظریہ، پہلی قوت کی اصلاح و تہذیب کے لیے فرمایا کہ جس شخص نے خدا کی رضامندی حاصل کرنے اور افراد ملت کی نصرت و اعانت میں اپنی دولت صرف کر دی اور ہمیشہ اعمال صالحہ کرتا رہا اپنے پروردگار کی نافرمانی نہ کی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی قوت نظریہ کو بھی فراموش نہ کیا بلکہ ہر نیکی کی تصدیق کی، انبیاء و رسل کی تعلیمات کی تکذیب نہ کی اور عقائد حسنہ کا پابند رہا تو ہم اس کے لیے ہر نیکی میں آسانی پیدا کر دیں گے۔

بخط مستقیم مخالف

(۸) وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی (۹) وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی (۱۰) فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی (۱۱) وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی۔ — اور جس نے بخل کیا، اور بے پروا بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا اسے بدبختی میں پہنچائیں گے اور جب وہ دوزخ کے گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

تردّٰی باب تفعل کے وزن پر ہے اور تردی من الجبل سے لیا گیا ہے جس کے معنی پہاڑ سے نیچے گرنے کے ہیں، اسی سے والمتردیۃ قرآن میں ہے۔

ان آیات میں اس شخص کے خصائص و امتیازات بیان کیے گئے ہیں جو عقائد و اعمال کے اعتبار سے پہلے کا بخط مستقیم مخالف ہے، وہ سخی تھا تو یہ بخیل، وہ متقی تھا اور یہ اپنے آپ کو تعلیمات الٰہیہ سے بالکل بے نیاز خیال کرتا اور ہر بُرے کام کا ارتکاب کرتا ہے، وہ ہر نیکی کی تصدیق کرتا تھا

اور یہ اُس کا شدید ترین مخالف ہے، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ اور زیادہ بدکرداری میں منہمک ہوگا، اور وہ راہ اس کے لیے آسان ہو جائے گی، مگر یہ یاد رکھے کہ جس مال و دولت کے غرور باطل میں وہ فسق و فجور کی زندگی بسر کر رہا ہے وہ اس کے لیے بیکار ہے اور دوزخ میں گرتے وقت وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا۔

علم النفس کے طلباء اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ جب ایک شخص کوئی کام کرتا ہے تو اس کا اثر اس کے تمام اعضاء و جوارح محسوس کرتے ہیں اگرچہ اس کو پہلے روز اس کے کرنے میں دقت محسوس ہوئی تھی، مگر دوسرے روز اس کو وہی کام نسبتاً آسان معلوم ہوگا، وھلم جراً، اسی حقیقت کو ان قرآنی آیات نے بیان کیا ہے اور اس کی تائید میں بکثرت احادیث پیش کی جا سکتی ہیں، بخاری نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک دن رسول اللہؐ کے ساتھ ایک جنازے کو دفن کرنے کی غرض سے بقیع غرقد میں موجود تھے، آپ نے صحابہ سے فرمایا: ما منکم من احد الا وقد کتب مقعدہ من الجنۃ ومقعدہ من النار، فقالوا یا رسول اللہ! افلا نتکل، فقال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ، ثم قرأ، فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ الی قولہ للعسریٰ، تم میں سے کوئی شخص نہیں جس کے متعلق جنت اور دوزخ کا فیصلہ نہ کر دیا گیا ہو، صحابہ نے عرض کیا تو پھر ہم اسی پر اعتماد کر کے عمل کیوں نہ ترک کر دیں، آپ نے فرمایا نہیں، عمل کیے جاؤ اس لیے کہ اس کو اسی کام میں آسانی پیدا کر دی جائے گی جس کے لیے اس کی تخلیق عمل میں آئی، اور اس کی تصدیق میں آپ نے ان آیات کی تلاوت کی جو زیب عنوان ہیں۔

اور اسی طرح دیکھا بھی جاتا ہے، نیک لوگوں کو بُرے اعمال کا ارتکاب مصیبت گزرتا ہے اور نیک کام خوش دلی سے کرتے ہیں اور بُرے لوگ بالکل اس کے برعکس ہیں۔

ابتداء و انتہا

(۱۲) اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی (۱۳) وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی (۱۴) فَاَنْذَرْتُکُمْ نَارًا تَلَظّٰی (۱۵) لَا یَصْلٰھَآ اِلَّا الْاَشْقَی (۱۶) الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی۔

ہمیں تو راہ دکھانا ہے، اور آخرۃ اور دنیا ہماری ہی چیزیں ہیں، سو میں نے تم کو بھڑکتی ہوئی آگ سے متنبہ کر دیا، اس میں وہی داخل ہوگا جو بڑا بدبخت ہے، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

تلظی شعلہ مارنا اور بھڑک اٹھنا، دوزخ کا ایک نام لظی بھی ہے کیونکہ اس کی آگ ہمیشہ بھڑکتی اور شعلہ مارتی رہتی ہے۔

ہمارا کام صرف اتنا تھا کہ ہر انسان کو نیکی اور بدی کی راہ دکھا دیں، چنانچہ سب سے اول ہم نے خود اس کے اندر ایک ایسی قوت رکھ دی جو نیک و بد میں تمیز کرے: بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ (۷۵: ۱۴ و ۱۵) بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے، اگرچہ عذر معذرت کرتا ہے، پھر اس قوت کی مزید تہذیب و تکمیل کے لیے ہم نے انبیاء کرام کا سلسلہ قائم کیا، انھیں کتابیں دیں، اس کے بعد بھی اگر ایک شخص گمراہ ہو جائے تو اس کی مرضی۔

ابتدا میں ہم نے مختلف فطرتیں پیدا کیں، ان کی اعانت کے لیے اسباب و وسائل فراہم کیے، اور آخر کار جو معیار ترقی ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے اس کے مطابق ان کے اعمال و اخلاق کا احتساب بھی ہم ہی کریں گے کہ ہم ہی اس کی ابتدائی حالت اور انتہائی نشو و ارتقا سے واقف ہیں، اس لیے جو لوگ اس راہ ترقی سے منحرف ہونا چاہتے ہیں انھیں اس آگ سے ہر وقت خوف زدہ رہنا چاہیے جس کا ایندھن بدبخت ابنائے آدم ہوں گے، اور وہ نامراد کون ہیں، وہی جو تعلیم الٰہی کا انکار کریں اور اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرکے ان علوم حقہ سے روگردانی کریں۔

ارباب تقویٰ

(۱۷) وَسَیُجَنَّبُھَا الْاَتْقَی (۱۸) الَّذِیْ

اور جو بڑا پرہیزگار ہے، وہ اس سے بچا لیا جائے گا، جو

يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۱۹) وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى (۲۰) اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (۲۱) وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى۔

اپنا مال دیتا ہے تاکہ پاک ہو، اور اس لیے نہیں دیتا کہ اس پر کسی کا احسان ہے، جس کا وہ بدلا اتارتا ہے بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے، اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا۔

گزشتہ آیات میں اشقی اور اس کے عواقب الیمہ بیان کیے گئے تھے، اب اتقی اور اس کے نتائج کا تذکرہ ہے، لسان شرع میں متقی وہ ہے جو اللہ کی راہ میں اپنی دولت صرف کرتا ہے، اس لیے نہیں کہ کسی کا اس پر احسان ہے، بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ تہذیب نفس، تزکیہ اخلاق، اور رضائے الٰہی حاصل ہو، اللہ تعالیٰ ان صدقات کو نہ صرف قبول فرمائے گا بلکہ اس کو اس قدر نعمتیں ارزانی کرے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

سورۂ بقرہ میں قبول صدقات کے لیے چند شرطیں بیان کی گئی ہیں، فرمایا: الذین ینفقون اموالہم فی سبیل اللہ ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی لہم اجرہم عند ربہم ولا خوف علیہم ولا ہم یحزنون (۲ : ۲۶۲) جو لوگ اپنے مال خدا کے رستے میں صرف کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا کسی پر احسان رکھتے ہیں، اور نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے پاس تیار ہے اور قیامت کے روز نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے، آگے چل کر آتا ہے: لا تبطلوا صدقتکم بالمن والاذی، اپنے صدقات وخیرات احسان رکھنے اور ایذا دینے سے برباد نہ کر دینا، اسی لیے حدیث میں انفاق فی سبیل اللہ کی ایک شرط یہ بھی بیان کی گئی: لا یعلم شمالہ ما انفق یمینہ جب وہ خرچ کرتا ہے تو اس طرح کہ اس کے بائیں ہاتھ تک کو یہ علم نہیں ہوتا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

یہی صدقات وخیرات اللہ کے دربار میں شرف اجابت حاصل کرتے ہیں، اور ایسے ہی خرچ کرنے والوں کو ہر قسم کی نعمتوں سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

الضحیٰ

(آیات ۱۱)

تلخیص مضامین

چند قدرتی مناظر پیش کر کے ثابت کیا کہ اللہ نے اپنے رسول کو نہیں چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے بلکہ عنقریب آپ پر اس قدر نعمتیں نازل کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے، پھر مزید اطمینان کے لیے فرمایا کہ آپ کی ترقی برابر جاری رہے گی، اور آپ کی ہر آئندہ حالت گذشتہ سے بہتر ہوا کرے گی، خدا کا یہ وعدہ جس طرح مستقبل کے لیے ہے ایسے ہی ماضی کے متعلق بھی تھا، اس پر آپ کی سابقہ زندگی کے بعض واقعات پیش کیے، اس کے بعد آپ کو وہ زمین بتائی گئی جہاں آپ کی تعلیم کا بیج باور آور ہوگا، اور جس جگہ آپ قرآن سنائیں گے۔



واما بنعمة ربك فحدث

شان نزول

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) وَالضُّحٰی (۲) وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی (۳) مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی۔

آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی جب چھا جائے کہ اے محمد تمھارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔

جب سورج اونچا ہو کر چمکنے لگے تو دن کے ابتدائی حصہ کو ضحیٰ کہتے ہیں، سجیٰ کے معنی ڈھانپ لینے اور چھا جانے کے ہیں، ودع اصل میں تودیع سے لیا گیا ہے، جس کے معنی رخصت کرنے میں مبالغہ کرنے کے ہیں، یہاں چھوڑنا اور دست بردار ہونا مراد ہے، قلیٰ ماخوذ ہے قلی سے بغض رکھنا اور ناراض ہونا۔

تمام مفسرین کے نزدیک یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ یہ سورت بالکل ابتدائی زمانہ نبوت میں نازل ہوئی تھی، روایات میں اس کے نزول کا جو سبب بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے: اشتکی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم یقم لیلۃ او لیلتین، فاتت امراۃ فقالت یا محمد ما اری شیطانک الا قد ترکک فانزل اللہ عزوجل والضحی واللیل اذا سجیٰ ما ودعک ربک وما قلیٰ (بخاری) ناسازی طبع کے باعث رسول اللہ دو ایک شب قیام نہ کر سکے تو ایک عورت نے آکر کہا کہ میرے خیال میں تمھارے شیطان نے تمھیں چھوڑ دیا ہے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

روایات اس امر پر متفق ہیں کہ فترۃ الوحی کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اور یہ کہ تاخیر الہام کی بنا پر آپ پژمردہ خاطر رہتے تھے، اس لیے اللہ نے یہ سورت نازل کی کہ آپ کو اطمینان ہو جائے کہ اُس نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور وہ آپ سے ناراض بھی نہیں، بلکہ آپ کے مدارج عالیہ میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔

دن اور رات کی شہادت

قدرت نے دن اور رات کا سلسلہ قائم کیا ہے: وجعلنا النہار معاشا، دن اس لیے ہے کہ انسان محنت کرے اور قوت بازو سے روزی کما کر نہ صرف خود کھائے بلکہ دوسروں کو بھی کھلائے، اس کے بعد رات آتی ہے: وجعل الیل سکنا، دن بھر کام کرنے کی وجہ سے اس کی جس قدر قوتیں مضمحل ہو چکی ہیں، وہ شب میں آرام کرنے کی وجہ سے عود کر آئیں اور دوسرے روز کے فرائض ادا کرنے کے قابل ہو۔

اسی پر تم وحی الٰہی کے نزول کو قیاس کرو، ایک الہام نازل ہوتا ہے، اس میں عقائد و یقینیات ہوتے ہیں، احکام و اوامر کی تعلیم ہوتی ہے، منہیات و جرائم سے روکا جاتا ہے، اور ان تمام الہامات کی غرض یہ ہوتی ہے، کہ لوگ ان پر عمل کریں، اور مہذب و شائستہ بن کر ترقی کر سکیں، کہ تدریجی ارتقا ہی ہمیشہ مفید اور پائدار ہوتا ہے۔

اگر اس کے برخلاف سلسلہ تعلیمات تو برابر قائم رہے، مگر لوگوں کو ان پر عمل کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ترقی نہ کر سکیں گے، اور تمام قانون کتاب کے اوراق ہی میں بند رہے گا، یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ دن تو برابر رہے اور رات نہ ہو، عاقبت کار کام کرتے کرتے قوتیں بالکل ہی مضمحل ہو جائیں گی، اور تھوڑی سی مدت کے بعد یہ دنیا جنگلی جانوروں کا مسکن بن جائے گی۔

پس نزول الہام وعدم نزول بالکل دن اور رات کی طرح ہی، بیچ میں جو زمانہ گذرتا ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا تم سے ناراض ہی، اور اس نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہی، بلکہ یہ تاخیر نہایت ہی اعلیٰ حکمت و مصلحت پر مبنی ہی، اور غرض یہ ہی کہ اس فرصت کے وقت میں نازل شدہ الہام پر خوب اچھی طرح عمل ہو جاے، اور مزید تعلیم قبول کرنے کی لوگوں میں قابلیت اور استعداد پیدا ہو۔

دائمی وعدہ

(۴) وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ (۵) وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ

اور آخرۃ تمہارے لیے پہلی حالت سے کہیں بہتر ہی، اور تمھیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔

اگرچہ مفسرین نے اولیٰ سے دنیا اور آخرۃ سے قیامت کے بعد کے ثمرات مراد لیے ہیں مگر حقیقت یہ ہی کہ ان الفاظ کا دائرہ محدود کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ربط آیات اسکا مقتضی ہی۔

چند روز تک وحی رک جانے سے رسول اللہ کو یہ گمان ہوتا ہی کہ اللہ آپ سے ناراض ہی، اور آپ کی روحانی ترقی رک گئی ہی، گذشتہ آیات میں آپ کو بتایا گیا کہ فترۃ وحی کا مقصد یہ نہیں جو آپ نے معین کیا ہی بلکہ اس کی غرض ہی بالکل دوسری ہی، قرآن کریم کے نزول کا مطلب یہ ہی کہ اس کی تعلیم سے ایک ایسی جماعت تیار ہو جو یکسر عمل ہو اور دوسروں کے لیے نمونہ بن سکے اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم تدریجاً نہ دی جاے کہ آہستہ آہستہ ان میں قوت عمل پیدا ہو اور وہ جاگیر ہو جاے پس اگر نزول الہام میں تاخیر ہو تو آپ اس سے پریشان خاطر نہ ہوں۔

قرآن آہستہ آہستہ تیئس سال میں نازل ہوا، کبھی تو ایک ہی وقت میں مختلف سورتیں نازل ہوتیں، اور کبھی دیر ہو جاتی تا آنکہ ضرورت کے مطابق وحی آتی، گویا اس کتاب عزیز کے نزول میں

وقت اور ضرورت کا لحاظ کیا گیا، ممکن تھا کہ پھر کبھی وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی تو آپ اس کو پھر ناراضگی پر حمل کرتے، اس لیے ان آیات میں ہمیشہ کے لیے آپ کو یہ بتا دیا گیا کہ آپ اس دیر سے گھبرانہ جایا کریں بلکہ آپ کی ہر آئندہ حالت گذشتہ سے بہتر ہوا کرے گی اور آپ کی ترقی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ رُکے گی۔

ہم نے اولی سے آپ کی پہلی حالت اور آخرت سے آئندہ کے حالات مراد لیے ہیں، سیاق وسباق کا اقتضا بھی یہی ہے، دوسری آیت بھی اسی پہلے وعدہ کی مزید تصدیق و توثیق ہے، کہ عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔

ماضی کی تذکار

(٦) اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (٧)	بھلا اس نے تمھیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی، بیشک دی،
وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (٨)	اور رستہ سے ناواقف دیکھا تو سیدھا رستہ دکھایا،
وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى۔	اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔

ان آیات میں بتایا جاتا ہے کہ وللاخرۃ خیر لک من الاولیٰ کا وعدہ اگرچہ ہم نے تم سے اب کیا ہے لیکن اگر تم اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالو تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ بدو طفولیت سے آج تک ہمارا طرز عمل تمہارے ساتھ یہی رہا ہے، مثلاً

(الف) آپ ابھی بطن مادری میں تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا، چھ برس کے تھے کہ والدہ فوت ہو گئیں، آپ کے دادا عبدالمطلب آپ کی پرورش کرتے رہے اور ان کے مرنے پر آپ کے چچا ابو طالب آپ کے متکفل ہوئے اور ہمیشہ آپ کی حمایت کرتے رہے۔

(ب) آپ نے ہوش سنبھالتے ہی عرب کو بد اخلاقی اور خانہ جنگی میں مبتلا پایا، آپ ان کی اصلاح کے خواہاں تھے، اور مختلف تدابیر کام میں لاتے تھے، آپ نے حلف الفضول میں شرکت کی مگر باوجود

ان باتوں کے وہ حقیقی راہ آپ کے سامنے ابھی نہ آئی تھی جو نہ صرف عرب کو ان نقائص و ذمائم سے پاک وصاف کر دیتی، بلکہ تمام عالم کو ہر قسم کے مصائب و آلام سے نجات دے دیتی: وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا، ماکنت تدری ما الکتب ولا الایمان، ولکن جعلنہ نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا، وانک لتھدی الی صراط مستقیم (۴۲: ۵۲) اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمھاری طرف روح القدس کے ذریعہ سے قرآن بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بیشک اے محمد تم سیدھا رستہ دکھلاتے ہو۔

آپ اس قانون کی تلاش میں تھے جو منبع ہدایت و سعادت ہو مگر آپ کو معلوم نہ تھا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے چالیس سال کے بعد قرآن نازل کرکے آپ کو حقیقی راہ بتا دی۔

(ج) عائل فقیر کو کہتے ہیں، جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ کو ایک اونٹنی اور ایک لونڈی کے سوا وراثت میں اور کچھ نہ ملا تھا، مگر آپ کی تجارت نہایت کامیاب ہے اور ادھر خدیجۃ الکبریٰ نے اپنی تمام دولت آپ کی نذر کر دی۔

غرض وہ خدا جس نے ان تمام حالات میں تمہاری دست گیری کی اب بھی تمہارے ساتھ ہے اور تمھیں وعدہ دیتا ہے کہ تمہاری ہر آیندہ حالت گذشتہ سے بہتر ہوا کرے گی و کان وعدا مفعولا۔

ارحموا من فی الارض

(۹) فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ (۱۰) وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔

تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا، اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتیمی کی تکلیف و مصیبت دیکھ چکے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ یتیم کا نہ تو کوئی نگران کار و مربی ہوتا ہے اور نہ اس کی تعلیم و تہذیب کا ذمہ دار و کفیل، اس کی کیفیت

اس پتے کی سی ہوتی ہے، جو جنگل میں ہو، ہوا کے جھونکے آتے ہیں، جو کبھی اس کو شمال کی طرف لیجاتے ہیں، اور گاہے جنوب کیطرف، اس حالت میں یتیم کی امداد و سرپرستی نہ صرف عام ہمدردی انسانی کا تقاضا ہوگا بلکہ قومی زندگی کے بقا و قیام کے لیے اس کی اعانت و دستگیری ضروری و لازمی ہوگی، آپ کی تھوڑی سی مدد اس کو آپ کا بے داموں غلام بنا دے گی جس جگہ آپ کا پسینہ گریگا وہ اپنا خون بہانے کو تیار رہوگا، وہ آپ کا دست و بازو بن جاے گا، اور آپ کے مقصد حیات کا بہترین معاون و مددگار، ادھر آپ کی تعلیم و تربیت کی بدولت وہ مہذب و شائستہ بن جاے گا اور جس قوم کے تمام افراد تعلیم یافتہ ہوں اس کے نتائج کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

لیکن اگر آپ نے اس کو پاے حقارت سے ٹھکرا دیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر مہذب بن کر قوم کے لیے بار دوش ثابت ہوگا، اپنی بداخلاقی و بدکرداری سے تمام ملت کو نقصان پہنچاے گا یا غیر مذاہب کے مبلغین و دعاۃ اپنے اثر سے کام لے کر اس کو اپنے مذہب میں داخل کرلیں گے، چنانچہ ہم روزمرہ ان الم ناک حوادث کا تذکرہ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں۔

ان مصالح کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ یتامے پر ظلم و ستم نہ کریں، اور ان کی ہر ممکن طریق سے امداد کریں، آپ نے فرمایا: انا و کافل الیتیم کھاتین، میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح باہم دگر ہوں گے جیسے ہات کی یہ دو انگلیاں۔

اسی کے ساتھ سائل کو بھی مت جھڑکو، اس لفظ کو بھیک مانگنے والے ہی میں حصر کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جس طرح ایک شریف مفلس و نادار پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے ویسے ہی وہ شخص بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے جو آپ سے کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کرنے کا آرزومند ہو، تم بخل مت کرو اور اس کو تعلیم دو۔

تبلیغ قرآن۔

(۱۱) وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا۔

اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں آپ کو نوازش کی ہیں، ان کا ذکر لوگوں کے سامنے کیجیے، ظاہر ہے کہ کوئی نعمت نہ تھی جو آپ کو نہ دی گئی ہو، مگر اعلیٰ و افضل ترین نعمت یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو قرآن دیا: ووجدک ضالا فھدیٰ، جس میں تمام نوع انسانی کی رشد و ہدایت اور فلاح و کامرانی کے اصول و ضوابط ہیں، جو دنیا و آخرت کی سعادت و فوز کبیر کا ذمہ دار و کفیل ہے، بس اس آیت میں ہمارے نزدیک نعمت سے مراد قرآن کریم کی دعوت و تبلیغ کا حکم ہے۔

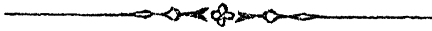
دوسرے لوگوں نے نعمت کی تفسیر میں کئی ایک چیزیں بیان کی ہیں، اور بے شبہ وہ سب ٹھیک اور درست ہیں، مگر ہم قرآن ہی کو بہتر خیال کرتے ہیں، یہی تبیانا لکل شئی ہے، شفاء لما فی الصدور ہے، اسی کی شان میں لاریب فیہ ہے، اسی کی تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تھی، اور اسی کی جب تکمیل ہو گئی تو آپ اس دار فانی سے ملاء اعلیٰ کی طرف تشریف لے گئے

الانشراح

(آیات ۸)

تلخیص مضامین

ابتدائی چار آیتوں میں ان رکاوٹوں کو بیان کیا جو داعی حق کی راہ میں آتی ہیں، پھر بتایا کہ دنیا میں تکلیف و راحت توام ہیں، اور آخر میں فرمایا کہ جب تم اپنے فرائض رسالت و دعوت الی الحق و ہجرت سے فارغ ہوا کرو تو انابت الی اللہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور ان فرصت کے اوقات میں تبتل الی اللہ اختیار کرو۔



رفع موانع

شرح صدر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (۱) اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ (۲) وَوَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ (۳) الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَکَ (۴) وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ۔

اے محمدؐ کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟ بے شک کھول دیا، اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی اور تمہارا ذکر بلند کیا۔

دنیا میں زندہ رہنے کا حق صرف اسی جماعت کو حاصل ہے جو اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو مگر یہ عظیم و جلیل فرض وہی شخص ادا کرسکتا ہے جو اس یقین و اذعان کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھے کہ ایسا کرنا میرا تقاضائے فطرت ہے اور یہی میری زندگی کا اصلی مقصد ہے گویا اس کی فطرت اس کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اس آواز کو دنیا کے ہر گوشہ اور کونے میں پہنچادے جب اس کی یہ حالت ہوگی تو کوئی بڑی سے بڑی رکاوٹ اور مزاحمت اس کو راہ حق سے منحرف نہ کرسکے گی۔

حضرت ابراہیمؑ جو آگ میں کود پڑے تو یہی داعیۂ فطرت تھا جس نے ان کو اس امر پر مجبور کردیا کہ جل جائیں مگر توحید کو ہاتھ سے نہ دیں لوط علیہ السلام کو اسی لیے ہجرت کرنی پڑی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کی ہر خواہش کو جو رد کردیا تو اسی لیے کہ توحید کے سوا ان کی فطرت اور

کسی چیز کو قبول ہی نہ کر سکتی تھی، شعیب علیہ السلام سے ان کی قوم کہتی ہے کہ تم بت پرستی کرو تو وہ اس سے کوسوں دور بھاگتے ہیں: قد افترینا علی اللہ کذبا ان عدنا فی ملتکم بعد اذ نجنا اللہ منہا (۷: ۸۹) اگر ہم اس کے بعد کہ خدا ہمیں اس سے نجات بخش چکا ہے تمہارے مذہب میں لوٹ جائیں تو بے شک ہم نے خدا پر جھوٹ افترا باندھا، جادوگر جب موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آتے ہیں تو فرعون کی دھمکیاں ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کر سکتیں۔

یہی شرح صدر ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، اور جب تک کسی کام کے متعلق یہ کیفیت کسی شخص میں نہ پیدا ہو، وہ عزم راسخ، بلند ہمت، اور استقلال و ثبات قدم سے کبھی بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا، فرض کے ادا کرنے میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل مخصوص سے رسول اللہ کی راہ سے اس کو دور کر دیا۔

بوجھ کا ہلکا ہونا

وزر بوجھ کو کہتے ہیں، انتقاض در اصل اس آواز کو کہتے ہیں جو بوجھ اٹھاتے وقت جانور کی پیٹھ سے نکلتی ہے یہاں اس سے کمر توڑنا مراد ہے:

دوسری رکاوٹ جو مبلغ حق اور داعی حریت کی راہ میں آتی ہے وہ اس کو اعوان و انصار کا نہ ملنا ہے اکثر تحریکات جو فنا ہو جاتی ہیں تو صرف انہی لیے کہ ان کے بانیوں کو رفقائے کار نہیں ملتے جو ان کے نصب العین کو اپنا مقصد حیات بنا کر اس کی نشر و اشاعت میں سر بکف کوشش کرتے۔

رسول اللہ دنیا میں آئے تو آپ اکیلے تھے، سرزمین عرب کے لیے آپ کی صدائے توحید ایک انوکھی اور غیر مانوس آواز تھی، آپ لوگوں کے پاس جاتے تھے، قبائل پر اپنے آپ کو پیش کرتے تھے، مگر ہر طرف سے انکار ہی انکار تھا، اور آپ ہر وقت حزین و ملول رہتے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اس رکاوٹ کو دور کر دیا اور آپ کو بہترین اصحاب نوازش فرمائے جنہوں نے اپنی تمام زندگیا

اور جائداد یں آپ کی محبت اور آپ کے مقصد کی اشاعت میں قربان کردیں۔

رفع ذکر

تیسری رکاوٹ یہ ہے کہ اگرچہ آپ کے مقاصد نہایت ہی شاندار اور بلند پایہ ہوں لیکن اگر آپ کے نام سے لوگ واقف نہ ہوں اور آپ نے اپنا لوائے شہرت بلند نہیں کیا، تو لوگوں کی حالت یہ ہے کہ آپ کی آواز پر کان تک نہ دھریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رکاوٹ بھی خدا نے دُور کردی، خود آپ کی زندگی ہی میں عرب کا ہر شخص آپ کے حالات سے واقف تھا، یہ شہرت ایک طرف تو آپ کو مخالفین کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی جو لوگوں کو آپ کے خلاف اُبھارتے، اور دوسری جانب آپ کے دعاۃ و مبلغین نشر و اشاعت اسلام میں مصروف تھے، اور جب کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا تو توحید کے ساتھ آپ کی رسالت کا بھی اقرار کرتا حضرت حسان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

وضم الالہ اسم النبی الی اسمہ	اذا قال فی الخمس المؤذن اشھد
اور اللہ نے اپنے نام کے ساتھ نبی کے نام کو بھی ملا دیا	چنانچہ موذن دن میں پانچ مرتبہ کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں
وشق لہ من اسمہ لیجلہ	فذو العرش محمود وھذا محمد

اور آپ کی جلالت قدر کے لیے خود اپنے نام میں سے آپ کا اسم گرامی رکھا صاحب عرش محمود ہے تو آپ کا نام محمد ہے

رنج و راحت

(۵) فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (۶) اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ — ہاں ہاں مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے، اور بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔

اگرچہ ابتدائے کار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت تکالیف و شدائد کا سامنا کرنا پڑا، مگر آخر کار ان سب تکلیفوں کے بادل چھٹ گئے، اور رنج و غم کے بعد سرور و راحت کے ایام آگئے،

پس کوئی شخص عارضی رکاوٹ کی وجہ سے پریشان خاطر نہ ہو، اس لیے کہ خدا کا یہ دائمی وعدہ ہے کہ ہر تکلیف کے بعد راحت کا آنا یقینی ہے، اُمت مسلمہ کے لیے ان آیات میں بہت بڑا درس عبرت و بصیرت ہے، وہ ان موجودہ ناگفتہ بہ حالات اور دول اسلامی کی بے چارگی سے گھبرا نہ جائے اس لیے کہ اسی ظلمت سے اُمید کی کرن نکلنے والی ہے اور یہی تاریکی شب صبح کے آنے کی خوشخبری دے رہی ہے۔

انابت الی اللہ

(۷) فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۸) تو جب فارغ ہوا کرو تو عبادت میں محنت کیا کرو،

وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو۔

لوگ اپنی کامیابی کے لیے ارباب دولت و ثروت پر اعتماد کرتے ہیں، اخبارات و جرائد کی امداد پر انھیں بھروسہ ہوتا ہے، شہرۂ آفاق ارباب سیادت و سیاست کے اشارۂ ابرو کے منتظر ہوتے ہیں، مگر درحقیقت ان میں سے کوئی جماعت بھی قابل اعتماد نہیں، اس لیے کہ یہ لوگ اسی وقت تک آپ کے ساتھ ہیں جب تک ان کے اغراض آپ کے ساتھ وابستہ ہیں، اور جہاں ان کے مقاصد کے خلاف کوئی بات ہوئی فوراً الگ ہو جائیں گے۔

داعی حق کے لیے صرف ایک ہی ذات ہے جو اعتماد و توکل کے لائق ہے، اور وہ صرف خدا کی ذات ہے جو نحن اقرب الیہ من حبل الورید کا مسرت انگیز پیام دیتی ہے، جو غار کی تاریکی اور دشمنوں کے ہجوم کے وقت بھی ان اللہ معنا سے ہمت افزائی کرتی ہے سورۂ توبہ میں یہی حکم دیا گیا: فقل حسبی اللہ لا الہ الا ہو علیہ توکلت و ہو رب العرش العظیم (۹ : ۱۲۹) تو کہدو کہ خدا مجھے کفایت کرتا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے، سورۂ شعرا کی یہی تعلیم ہے: وتوکل علی العزیز الرحیم الذی یراک حین تقوم وتقلبک فی الساجدین،

(۲۶: ۲۱۷ تا ۲۱۹) اور خدائے غالب اور مہربان پر بھروسا رکھو، جو تم کو جب تم تہجد کے وقت اٹھتے ہو دیکھتا ہے، اور نمازیوں میں تمہارے پھرنے کو بھی، سورۂ مزمل میں یہی سبق دیا: واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا، رب المشرق والمغرب لا الہ الا ہو، فاتخذہ وکیلا' (۷۳: ۸ و ۹) تو اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو، اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اُسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ، وہی مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اُسی کو اپنا کارساز بناؤ۔

آیات زیر بحث میں اسی امر کی طرف توجہ دلائی کہ جب آپ تبلیغ رسالت کے فرائض سے فارغ ہو جایا کریں تو فوراً خدا کی طرف رجوع کریں، اور اس کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کی امداد واعانت کے طالب ہوں، کہ اس کی نصرت و دست گیری کے بغیر کسی انسان کو کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

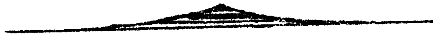


التین

(آیات ۸)

خلاصۂ مضمون

انسان کی فطرت نیک ہے یا بد، حکمائے قدیم وجدید کا اس کے متعلق سخت اختلاف ہے، اس سورۂ مبارکہ نے چند شہادتیں ذکر کر کے اس حقیقت مستورہ کو بے نقاب کیا کہ انسان فطرت اسلام وصلاحیت پر پیدا کیا گیا ہے، پھر اس کے خراب کرنے والوں اور قائم رکھنے والوں کے نتائج بیان کر کے بتا دیا کہ جزائے اعمال سے انکار کرنا غیر ممکن اور محال ہے، اس لیے کہ اللہ احکم الحاکمین ہے اور وہ ضرور ہر ایک انسان سے فرداً فرداً بازپرس کرے گا۔



فما یکذبک بعد بالدین

تین اور زیتون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ (۲) وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ (۳) وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ (۴) لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ۔

انجیر کی قسم، اور زیتون کی، اور طور سینین کی، اور اس امن والے شہر کی کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

تین کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں، بعض کہتے ہیں کہ تین سے مراد مسجد دمشق ہے، ایک جماعت کی رائے میں یہ اس پہاڑ کی طرف اشارہ ہے جو دمشق کے متصل ہے، قرطبی کی رائے میں اصحاب کہف کی مسجد ہے، عوفی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ تین وہ مسجد ہے جسے نوح علیہ السلام نے کوہ جودی پر تعمیر کیا تھا، مجاہد کہتے ہیں کہ یہ وہی انجیر کا درخت ہے اور اس کا پھل جسے ہر شخص جانتا ہے۔

یہی اختلاف زیتون کے متعلق بھی ہے، کعب، قتادہ، ابن زید اور دوسرے لوگوں کی رائے میں یہ بیت المقدس ہے، مجاہد اور عکرمہ کہتے ہیں کہ یہ وہی زیتون ہے جس کا تیل نکالتے ہو، ابن عباس کی رائے میں یہ بلاد فلسطین کی طرف اشارہ ہے، مگر اس روایت میں ایک مجہول راوی موجود ہے، اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

ان اقوال مختلفہ میں سے ہماری رائے یہ ہے کہ تین سے مراد وہ جگہ ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان سے نجات پانے کے بعد کوہ جودی کے اوپر نماز پڑھی تھی، استشہاد درصل اس مقام سے نہیں بلکہ اس کا ذکر کرکے حضرت نوحؑ ان کی نبوت، اور اس کے ثمرات ونتائج کی طرف توجہ دلا کر یہ بتانا ہے کہ ہم نے انسان کو ہر اعتبار سے اشرف مخلوقات پیدا کیا ہے، نوح اور اس کے ہمراہان سفر اپنی فطرت صالحہ پر قائم رہنے اس لیے وہ نہ صرف اعلیٰ ترین مراتب انسانیہ پر فائز ہو گئے بلکہ خوفناک طوفان سے بھی نجات پاگئے، مگر جن لوگوں نے اس رسول کی نافرمانی کی اور اپنی فطرت کو خراب کر لیا، وہ ذلیل ترین عذاب میں مبتلا ہوئے۔

زیتون سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے اس لیے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا، عیسائیوں میں اب تک اس کے تیل کو مقدس تیل کہا جاتا ہے تھوڑا سا تیل رسم تاج پوشی ادا کرنے کے لیے بادشاہ کو لگایا جاتا ہے، اور شام کے لوگ زیتون کا تیل اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح ہمارے ملک میں گھی۔

پس یہاں مسجد بیت المقدس کا ذکر کرکے حضرت عیسیٰؑ، ان کی نبوت، اور اس کے ثمرات کی طرف توجہ دلا کر یہ بتانا ہے کہ اگر ایک شخص اپنی فطرت کے آئینہ کو گرد وغبار ضلالت سے پاک و صاف رکھے تو وہ ان مدارج عالیہ تک ترقی کر سکتا ہے۔

بقیہ اقسام

طور سینین اور بلد امین میں کسی کو اختلاف نہیں بلکہ سب اسی امر پر متفق ہیں کہ طور سے وہ پہاڑ مراد ہے جہاں حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ سے شرف ہم کلامی نصیب ہوا، اور بلد امین سے غرض مکہ معظمہ کا ذکر کرنا ہے۔

استشہاد کا مقصد۔

اللہ تعالےٰ نے چار مقامات کا تذکرہ کر کے ان نبوتوں کی طرف توجہ دلائی جن کا ان مقامات میں ظہور رہوا

(الف) مسجد جودی جہاں حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے بعد خدا کا شکر ادا کیا۔

(ب) زیتون شام جس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا۔

(ج) طور سینین حضرت موسیٰ علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوے۔

(د) بلد امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوے۔

غرض ان چار مقامات کے ذکر سے یہ ہے کہ انسان کے شرف و مجد کو واضح کیا جاے، اور یہ حقیقت اصلیہ لوگوں کے سامنے آجاے کہ وہ بدکرداروں کو دیکھ کر فسق و فجور پر قانع نہ ہو جائیں، بلکہ طہارت و پاکیزگی کے ان اعلےٰ ترین نمونوں کو دیکھ کر نیکی اور فرشتگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں اس لیے کہ ہم نے ہر شخص کو بہترین شکل و صورت پر پیدا کیا ہے، اور اسے اعلےٰ ترین اخلاق و جذبات نوازش کیے ہیں۔

احسن تقویم

آیت لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ان تمام سابقہ اقسام کا جواب ہے، ابن عباس اس کے یہ معنی کرتے ہیں: فی احسن خلق، واحدی دوسرے مفسرین کی راے یوں بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کو موبنہ کے بل جھکا ہوا پیدا کیا ہے، مگر انسان کو سیدھا بنایا ہے، اور اسے علم، فہم، نطق، عقل، تمیز اور ادب سے آراستہ کیا ہے، پس وہ ظاہر و باطن کے اعتبار سے بہترین طریق پر پیدا کیا گیا ہے، تقویم کے معنے تعدیل کے ہیں، قرطبی کے نزدیک انسان کا اعتدال و استوا مراد ہے۔

ان تمام اقوال میں کسی قسم کا اختلاف نہیں بلکہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں،

اور وہ یہ ہے کہ فرزند آدم نہ صرف ظاہری اعضاء و جوارح کے اعتبار سے بہترین ہے بلکہ جذبات و عواطف کے لحاظ سے بھی اس کی فطرت بالکل صالح اور نیک ہے، اب اگر وہ بدی کرتا ہے تو یہ اس کی فطرت کا تقاضا نہیں بلکہ ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

یہی اس سورت کا موضوع ہے، اور گذشتہ انبیاء کرام کا تذکرہ کرکے یہی بتانا ہے کہ انسان کی فطرت بہترین پیدا کی گئی ہے، اور وہ محض نیکی ہی نیکی ہے شر و فساد کا اس میں نام و نشان تک نہیں۔

بدترین خلائق

(۵) ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی حالت کو بدل کر پست سے پست بنا دیا،

جو لوگ اپنے قلب سلیم کی خارجی اثرات ضلالت سے حفاظت نہیں کرتے، اور اپنے صاف و شفاف آئینہ فطرت کو گرد آلود ہونے دیتے ہیں، تو وہ جس طرح کہ اشرف مخلوقات تھے اب شر البریہ بھی بن جاتے ہیں، وہی الاعمی ہیں، اور وہی حیوانات سے بھی بدتر ہیں: لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اذان لا یسمعون بہا ولہم اعین لا یبصرون بہا، اولئک کالانعام بل ہم اضل اولئک ھم الغافلون۔

یہ فیصلہ کسی ایک جماعت اور ایک وقت سے مخصوص نہیں بلکہ یہ ایک عالم گیر قانون ہے، اور ہر گروہ اور وقت کے لیے ہے، اسی پر نوح کے زمانہ میں عمل کیا گیا، ابراہیم و موسیٰ کے لوگوں کے ساتھ اسی کے مطابق سلوک ہوا، اور عیسیٰ و محمد علیہم الصلوۃ والسلام کے وقت بھی یہی سنۃ اللہ تھی، پس کوئی شخص بھی اس قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا، اور ہر ایک فطرت صالحہ کو مسخ کرنے والا معذب ہوگا۔

ایک استثناء

(۶) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے

فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۔ پس بے انتہا اجر ہے۔

مگر اب بھی ہم بتائے دیتے ہیں کہ ایک شخص خواہ بے انتہا جرائم و معاصی کا مرتکب ہو، اسے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ جس وقت وہ ایمان باللہ کو اپنا طغرائے امتیاز بنائیگا اور نیک کام کو اپنی غایت الغایات تو اُسے اتنا اجر ملے گا کہ اس کی کوئی حد نہ ہوگی، اور آخرۃ کے عذاب سے اگر کوئی چیز نجات دلاسکتی ہے تو وہ ایمان باللہ اور عمل صالح ہی ہے۔

جزائے اعمال

(۷) فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ تو اے آدم زاد! پھر تو جزا کے دن کو کیوں جھٹلاتا ہے،

(۸) اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ ۔ کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے۔

کیا ان شہادتوں کے بعد کسی شخص کو یہ ہمت ہے کہ جزائے اعمال کا انکار کرے، ان پیغمبران جلیل اور ان کے رفقائے کار کو جو اجر غیر ممنون سے سرفراز کیا گیا تو یہ ان کے اعمال صالحہ ہی کا نتیجہ تھا، اور اگر دوسروں کو شرالبریہ بنایا گیا تو یہ بھی ان کی بدکرداری کا ثمرہ تھا۔

یہ حقائق عالیہ تمہارے سامنے ہیں، تاریخ کے اوراق ان واقعات سے بھرے پڑے ہیں، اور سب کے سب بانگ دہل بتارہے ہیں کہ جزائے اعمال یقینی ہے، اور ہر شخص سے اس کے کاموں کے متعلق بازپرس کی جائے گی، اب جو شخص اس جوابدہی اور مسئولیت سے انکار کرتا ہے وہ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ نیک و بد کا انجام ایک ہی ہوگا، روشنی اور تاریکی میں اس کے نزدیک کوئی فرق نہیں، زہر اور قند ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، اور سب سے آخر میں یہ اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں، جو نیکوں اور بدوں کو ایک ہی قسم کا بدلا دے رہا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے، انبیائے کرام کے واقعات اس پر شاہد ہیں، خدائے قدوس ضرور نیک و بد میں تمیز کرتا ہے، اور ہر ایک کو اس کا بدلا دیتا ہے: ام حسب الذین اجترحوا السیات

ان نجعلهم کالذین امنوا وعملوا الصلحٰت سواء محیاهم ومماتهم ساء مایحکمون (۴۵ : ۲۱) جو لوگ برے کام کرتے ہیں، کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو اُن لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہو گی، یہ جو دعوے کرتے ہیں، برے ہیں، سورۂ قلم میں فرمایا: افنجعل المسلمین کالمجرمین، مالکم کیف تحکمون (۶۸ : ۳۵ و ۳۶) کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کی طرح نعمتوں سے محروم کر دیں گے، تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسی تجویزیں کرتے ہو، ایک جگہ آتا ہے: ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصلحٰت کالمفسدین فی الارض، ام نجعل المتقین کالفجار (۳۸ : ۲۸) جو لوگ ایمان لائے، اور عمل نیک کرتے رہے کیا ان کو ہم ان کی طرح کر دیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں، یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے۔

پس خدا کے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ نیک و بد میں تمیز ہو، اور ہر ایک کو الگ الگ اپنے اپنے کام کا بدلا ملے۔



العلق

(آیات ، ۱۹)

تلخیص مضامین

آیت ۱ سے ۵ تک یہ بتایا گیا کہ قرآن کا نزول محض اللہ کے کرم کا نتیجہ ہے ، مگر انسان اس صحیح تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتا ، پھر آیت ۹ سے ۱۴ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا تذکرہ کیا ، اور آخر میں فرمایا کہ اگر دشمنان اسلام اس تعلیم کی مخالفت سے باز نہیں آتے تو ان کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ، پس داعی حق ان مخالفین کی اطاعت نہ کرے ، بلکہ توجہ و انابت الی اللہ کو اپنا شعار بنا لے ۔



دشمنان اسلام کی بربادی

شوق عبادت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (۲) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۳) اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ (۴) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۵) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔

اے محمد اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو، جس نے عالم کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ قبل از نبوت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کئی کئی روز تک غار حرا میں معتکف رہتے، تاآنکہ پورے چالیس سال کے بعد اللہ نے اپنا ابتدائی الہام نازل کیا، اور جبریل نے ان آیات کی تلاوت کی جو زیب عنوان ہیں آپ خوف زدہ ہو کر گھر آئے، اور خدیجہ سے تمام قصہ بیان کیا انہوں نے کہا آپ مجسمہ نیکی اور فرشتگی ہیں، اللہ آپ کو ہلاک نہیں کرے گا، اور مزید اطمینان کے لیے ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جنہوں نے تمام حالات سننے کے بعد کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ فرشتہ جبرئیل ہے جو موسیٰ کے پاس آیا کرتا تھا۔

آپ کا خوف زدہ ہونا

بعض لوگوں نے مذکورۃ الصدر روایت کو اس لیے مجروح قرار دیا ہے کہ رسول ایسے موقع پر خوف زدہ نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ آپ کو ورقہ بن نوفل ایک عیسائی عالم کی تصدیق پر اطمینان ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ ناموس الٰہی کا آنا آپ کی زندگی کا اولین موقع تھا، اس لیے خوف زدہ ہونا قدرتی امر تھا، جس وقت حضرت ابراہیم کے مہمانوں نے کھانا نہ کھایا، تو وہ بھی اس سے ڈر گئے تھے: فلما را ایدیہم لا تصل الیہ نکرہم واوجس منہم خیفۃ، قالوا لا تخف انا ارسلنا الی قوم لوط، (۱۱: ۷۰) جب دیکھا کہ ان کے ہات کھانے کی طرف نہیں جاتے یعنی وہ کھانا نہیں کھاتے تو اُن کو اجنبی سمجھ کر دل میں خوف کیا، فرشتوں نے کہا کہ خوف نہ کیجیے ہم قوم لوط کی طرف اُن کے ہلاک کرنے کو بھیجے گئے ہیں، جب فرعون کے دربار میں جادوگروں نے نظر بندی کر کے رسّیوں کو سانپ کر دکھایا، تو موسیٰ بھی ڈر گئے تھے: فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ قلنا لا تخف انک انت الاعلیٰ (۲۰: ۶۷ و ۶۸) اس وقت موسیٰ نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا، ہم نے کہا خوف نہ کرو، بلا شبہ تمہیں غالب ہو، حضرت داؤد کا بھی یہی حال ہوا تھا: اذ دخلوا علیٰ داؤد ففزع منہم قالوا لا تخف (۳۸: ۲۲) جس وقت وہ داؤد کے پاس آئے تو وہ ان سے گھبرا گئے انہوں نے کہا کہ خوف نہ کیجیے۔

ان تمام امثال سے یہ معلوم ہو گیا کہ خوف زدہ ہونا پیغمبری میں کوئی نقص نہیں پیدا کرتا پھر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیے کہ آپ کے خاندان میں نبوت کا سلسلہ نہ تھا۔ اور نہ انبیاء کرام کی اس قسم کی حالتوں سے عرب کے لوگ واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے نزول وحی کے وقت آپ کی خاص کیفیت دیکھی تو اس کو جنون و سحر کی طرف منسوب کیا، اور آپ کو پاگل کا نام دیا، عرب ان پڑھ تھے، اس لیے آپ کے اطمینان کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے جو سلاسل انبیاء سے واقف تھے، چنانچہ ورقہ کی شہادت پر آپ کی پریشانی

ہوگئی، پھر اس کے بعد اس قسم کا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا۔

ما انا بقاری

جس وقت ناموس الٰہی نے آپ سے پڑھنے کو کہا تو آپ نے فرمایا کہ میں قاری نہیں ہوں اور نزول وحی کے بعد آپ ڈر گئے، اس کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو اوپر گذر چکی، اس کا دوسرا مطلب یہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ جس وقت جبریل نے آپ سے پڑھنے کو کہا، اور آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ میرے اوپر ایک عظیم الشان بوجھ ڈالا جا رہا ہے، اور تمام دنیا کی ہدایت و سعادت میرے متعلق کر دی گئی ہے۔ تو آپ اس عظیم ترین ذمہ داری کو دیکھ کر گھبرا گئے کہ میں عاجز و مسکین بندہ اتنا بڑا بار نہیں برداشت کر سکتا، میرے کندھے اس کے اٹھانے سے کمزور ہیں، میں تو ہلاک ہو جاؤں گا، اس پر خدیجۃ الکبریٰ نے عرض کیا: ابشر فواللہ ما یخزیک اللہ ابداً انک لتصل الرحم، وتصدق الحدیث وتحمل الکل و تقری الضیف وتعین علی نوائب الحق، بشارت ہو آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی آپ کا شیوہ ہے، تکالیف و شدائد میں آپ دوسروں کی مدد کرتے ہیں، بھلا ایسے آدمی کو بھی خدا ذلیل کرے گا، کبھی نہیں۔

تو یہ دراصل گراں باری فرض کا خوف تھا، اپنی ذمہ داری کا ڈر اور مسئولیت کا خیال تھا، اس کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔

ابتدائی الہام

مفسرین اس امر میں اختلاف کرتے ہیں کہ اولین الہام کون سا تھا، بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ اقرا کی یہی آیات نازل ہوئیں جو زیر بحث ہیں، ایک گروہ سورۂ فاتحہ کو اور دوسرا سورۂ مدثر کو اولین الہام قرار دیتا ہے۔

ہماری راے یہ ہی کہ تینوں اقوال اپنے اپنے اعتبار سے بالکل ٹھیک ہیں، سورہ علق کی ان آیات میں صرف اس امر کی آپ کو اطلاع دی گئی ہی کہ آپ کی معرفت تمام دنیا میں نور توحید پھیلنے والا ہی، اس اعتبار سے یہی اولین الہام ہی مگر جن لوگوں نے سورہ مدثر کو اولین کہا تو ان کا منشا یہ تھا کہ اب آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ فرض تبلیغ ادا کرنے کو تیار ہو جائیں، چنانچہ قم فانذر کے الفاظ اسی توجیہ کی تائید کرتے ہیں، گویا اولین تیاری کا حکم سورہ مدثر ہی میں دیا گیا اور اس لحاظ سے یہی پہلا الہام ہی، لیکن جن حضرات نے سورہ فاتحہ کو اولیت دی ہی تو انکی غرض یہ تھی کہ قانون اور دستور العمل کے لحاظ سے ایک مکمل سورۃ سب سے پہلے یہی نازل ہوئی ہی۔

رجوع الی المقصود۔

العلق، الدم الجامد، جما ہوا خون، جب فرشتہ نے غار حرا میں آپ سے کہا تو پڑھ تو آپ نے جواب دیا کہ میں پڑھا لکھا نہیں، اور یہ جملہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا، مگر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اگرچہ تم لکھنے پڑھنے سے واقف نہیں، مگر ہم عنقریب تم پر ایک کتاب نازل کرنے والے ہیں، اور تم میں پڑھنے کی صفت پیدا کر دیں گے، دیکھو ہم نے اس کائنات ارضی و سماوی کو عدم محض سے پیدا کیا ہی، پس جو خدا ان تمام چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہی وہ تمہیں پڑھوانے پر بھی قدرت رکھتا ہی، بس تم اس کے حکم اور ارادے سے پڑھو۔

تم انسان کی پیدائش پر غور کرو، جنین کی ابتدائی حالت یہ ہوتی ہی کہ وہ محض خون کی ایک پھٹکی ہوتا ہی، مگر اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ وہ اسی خون بستہ کو ایک حی و قائم اور دانا و بینا انسان بنا دیتا ہی، پھر وہی انسان علم و معرفت کی بنا پر اشرف مخلوقات بن جاتا ہی، اور ہر چیز کو اپنا مطیع و منقاد بنا لیتا ہی، پس جس خدا کی یہ صفات و مختصات ہوں، وہ تم جیسا انسان کامل بھی بنا سکتا ہی، اور تمہیں پڑھنے کی قوت بھی نوازش فرما سکتا ہی، پس تم اسی اللہ کا نام لے کر پڑھو۔

احسانات خداوندی

اس رب کریم کا نام لے کر شروع کر جس نے ایک طرف تو گوشت کے لوتھڑے، زبان کو ذریعۂ افہام و تفہیم بنایا اور دوسری جانب ایک بے جان لکڑی قلم کو وجہ بیان و تبیین اور وسیلۂ بقائے علوم و خیالات بنایا، یاد رکھو وہ تمہیں بھی قاری اور معلم بنانے پر قادر ہے، اس خدا کی طرف نظر کر جس نے انسان کو ان باتوں کی تعلیم دی جن سے وہ واقف نہ تھا، پس وہی معلم حقیقی تمہیں اتنا علم نوازش کرے گا کہ تمام عالم کی امتیں اور قومیں مل کر بھی اس علم کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔

انسان کی سرکشی

(۶) كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ
(۷) اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (۸) اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى۔

مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے، جب کہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے کچھ شک نہیں کہ اس کو تمہارے پروردگار ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

سابقہ آیات کے نزول کے بعد وحی کا آنا ایک مدت تک رک گیا، جس کا ضروری تذکرہ والضحیٰ کی تفسیر میں آچکا ہے، یہ ٹکڑا آخر تک کئی سال کے بعد نازل ہوا، اللہ کی ربوبیت تو وہ کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم اور جود و بخشائش سے انسان کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی ارتقا کا بھی سامان کیا، اور رسول اللہ کو کتاب مبین دی، اب چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ حیوان ناطق ظلوم و جہول انسان اس کے آگے جھک جاتا، اور سوائے اس کے اور کسی کو نہ پکارتا، مگر اس کے طغیان و سرکشی کی یہ کیفیت ہے کہ تھوڑے سے مال و منال پر اتنا اترا جاتا ہے کہ کسی قانون اخلاق و مروت کی پروا تک نہیں کرتا، اور اپنے آپ کو پابندی قرآن سے بالاتر خیال کرتا ہے، حالانکہ انجام کار اسے اسی رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے جس نے اس پر یہ نعمتیں نازل کیں، وہ ایک ایک کا حساب لے گا۔

مخالفت کی انتہا

(۹) اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی (۱۰) عَبْدًا اِذَا صَلّٰی (۱۱) اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْھُدٰی (۱۲) اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی (۱۳) اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۱۴) اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے، یعنی ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے، بھلا دیکھو تو اگر یہ راہ راست پر ہو یا پرہیزگاری کا حکم کرے تو منع کرنا کیسا، اور دیکھو تو اگر اس نے دین حق کو جھٹلایا، اور اس سے منوہ موڑا، تو کیا ہوا، کیا اس کو معلوم نہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے۔

دنیا میں آپ کو اس قسم کے لوگ بھی ملیں گے جو حق کی تلاش و جستجو میں تو ہیں مگر اپنے احباب واقرباب کے دباؤ سے اس راہ کو ترک کر دیتے ہیں، اور پھر اسی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اُن لوگوں کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں جو پیکر صدق واخلاص ہیں اور طہارت وپاکیزگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ایک شخص اللہ کی یاد کرتا ہے اس کی ربوبیت کو تسلیم کر کے اُس کے آگے جھکتا ہے، لوگوں کو ورع و تقوی کی تعلیم دیتا ہے، مگر ادھر اس بدبخت انسان کو بھی دیکھو جس نے اس کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا ہے، صلوٰۃ الٰہی ادا کرنے سے لوگوں کو روکتا ہے جس بات کو خود اس کا دل تسلیم کرتا ہے اس کے جحود وانکار کا مرتکب ہوتا ہے، اپنے فطری جذبات کے مٹانے کی فکر میں ہے کیا اچھا ہوتا اگر وہ خود راہ صدق واخلاص اختیار کرتا، اور دوسروں کو اسی طرف بلاتا مگر وہ تو اس کے بخط مستقیم مخالف ہے تو پھر کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، اگر یہ شقی ازلی لوگوں کے مواخذہ سے بچ گیا تو اللہ کی بازپرس سے کہاں نجات پائے گا اس کی پکڑ تو بڑی ہی سخت ہے، انّ اخذہ الیم شدید۔

تباہی کا اعلان

(۱۵) كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ ۵ لَنَسْفَعًا
بِالنَّاصِيَةِ (۱۶) نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ
(۱۷) فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ (۱۸) سَنَدْعُ
الزَّبَانِيَةَ (۱۹) كَلَّا، لَا تُطِعْهُ
وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب -

دیکھو اگر وہ باز نہ آئے گا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے، یعنی اس جھوٹے خطاکار کی پیشانی کے بال، تو وہ اپنے یاران مجلس کو بلالے، ہم بھی اپنے موکلان دوزخ کو بلائیں گے، دیکھو اس کا کہا نہ ماننا اور سجدے کرنا اور قرب خدا حاصل کرتے رہنا۔

لنسفعاً دراصل لنسفعن تھا، عام کتابت میں تو یوں ہی لکھا جاتا ہے، مگر قرآن کے رسم الخط میں اس کو الف سے تحریر کرتے ہیں، لغت میں سفع کے معنی کسی چیز کو شدت کے ساتھ کھینچنے کے ہیں، نادی مجلس شوریٰ کو کہتے ہیں، لوگ اس میں باہمی مشورہ کرتے ہیں، اسی سے دارالندوہ ہے، اس جگہ نادیہ سے اس کے یاران مجلس اور ہم نشین مراد ہیں، زبانیہ جمع ہے زبینۃ کی، زبن کہتے ہیں دفع کرنے کو، زبانیہ وہ فرشتے جو کفار کو دوزخ میں دھکے دے کر ڈال دیں گے۔

اگر باوجود تذکیر و موعظت اور پند و نصیحت مخالفین اسلام اپنی ضد اور عداوت پر برابر قائم رہے، اور تعلیمات قرآن و فرزندان اسلام کے برباد کرنے میں سعی و کوشش کرتے رہے تو ہم انھیں ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ وہ تیار ہو جائیں، اپنے تمام اعوان و انصار کو جمع کرلیں، اور اپنے امکان بھر اسلام کی مخالفت کریں، ہم نے بھی ان کی تباہی و بربادی کا فیصلہ کرلیا ہے، ان بدبختوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتاریں گے، اور کتے کی موت ماریں گے، ان کی فنا سامانی کے لیے انسانوں ہی کی ایک جماعت کھڑی کردیں گے، اور اسی دنیا میں ان کی ہلاکت کے تمام سامان جمع کردیں گے۔

دنیا ایک مرتبہ اس کا تجربہ کرچکی ہے، ابوجہل نے رسول اللہ اور مسلمانوں کی مخالفت کی

چند ہی روز کے اندر غزوہ بدر میں وہ ذلیل ترین موت مرا، اسلام کی مخالفت کرنے والے یہ یقین کرلیں کہ جس طرح یہ قانون ابوجہل وابولہب کے لیے تھا ویسے ہی آج بھی ہر فرعون کے لیے ہے، باقی کفار ومعاندین کی سعی وکوشش سے فرزندان اسلام کو پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے وہ انکی پرواتک نہ کریں، توجہ وانابت الی اللہ کو اختیار کریں کہ توکل واعتماد علی اللہ ہی فوز وکامرانی کی مفتاح حقیقی ہے۔

تاخیر کا سبب

ہم گذشتہ اوراق میں یہ بیان کرچکے ہیں کہ اولین الہام صرف پانچ آیات تک ہی ہوا اور باقی سورت کئی سال کے بعد نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان خداوندی کے مطابق لوگوں کو راہ حق کی طرف بلانا شروع کردیا اور مزید تعلیم وتربیت کے لیے دوسری سورتیں حسب ضرورت نازل ہوتی رہیں، مگر آپ کی دعوت کے ساتھ ساتھ معاندین کی سعی وکوشش بھی زور پکڑتی گئی اور قدم قدم پر مخالفت ہونے لگی اس بغض وعداوت اور کفر وجہود کو دیکھکر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کی سرزنش ضروری ہے، ورنہ کلمۃ اللہ بلند وبرتر نہ ہوسکے گا، اور رشد وہدایت کا سلسلہ رک جائے گا۔

اس مخالفت سے قبل آپ کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ لوگ آپ کی مخالفت کریں گے کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ میں انہیں ایسی چیز دے رہا ہوں جو ان کی دنیا اور آخرت کے لیے یکساں طور پر مفید ونافع ہے، پھر کس کو ہمت ہوگی کہ ایسے مثمر برکات ونتائج قانون کی مخالفت کرے چنانچہ جس وقت ورقہ بن نوفل نے آپ سے نزول الہام کی تفصیل سنی تو کہا: ہذا الناموس الذی انزل علی عیسیٰ لیتنی فیہا جذعا، لیتنی اکون حیا حین یخرجک قومک، یہ تو وہی فرشتہ ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا، اے کاش میں اس وقت طاقتور ہوتا، اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب

تمہاری قوم والے تمہیں ہجرت پر مجبور کریں گے، یہ سن کر آپ حیران رہ گئے، اور پوچھنے لگے:
اومخرجی ہم، کیا وہ مجھے جلاوطن کر دیں گے، ورقہ نے کہا: نعم لم یات رجل قط بما جئت بہ
الا عودی، وان یدرکنی یومک انصرک نصرا موزرا، ہاں ہاں جو شخص بھی یہ تعلیم لاتا ہے، جس کے حامل
آپ ہیں تو اس کی ضرور مخالفت ہوتی ہے، اور اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپ کی پوری پوری
امداد واعانت کروں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجسمۂ رحمت وشفقت تھے اس لیے آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی
لوگوں کی مخالفت اور عداوت کا گمان نہ تھا، اسی لیے آپ نے ورقہ کی بات پر اظہار تعجب کیا،
بہرحال کئی سال تک آپ دعوت و ارشاد میں مصروف رہے، مگر حالت یہ تھی کہ جس قدر آپ ان کو
حق کی طرف بلاتے تھے اسی قدر وہ مخالفت میں بڑھتے چلے جاتے تھے، آپ کعبہ میں نماز ادا
کر رہے ہیں اور لوگ آپ کے ساتھ تمسخر و استہزا کر رہے ہیں، ابولہب عین جلسہ میں آپ کو مخاطب
کر کے کہتا ہے: تباً لک سائر الیوم الہذا جمعتنا، طائف میں جاتے ہیں تو لہولہان ہو کر واپس
آتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ مدتہائے دراز تک اس دشمنی کا سلسلہ جاری رہا، تا آنکہ ارباب ایمان کی انتہائی تکلیف
ومصیبت اور کلمہ حق کی عاجزی و درماندگی دیکھ کر آپ میں جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا، اور اب آپ کی
طبیعت خود اس امر کی مستدعی ہوئی کہ کفار و معاندین اسلام کی تنبیہ و تادیب ضروری ہے۔

جب نوبت یہاں تک آگئی اور آپ کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو گیا تو خدائے حق نواز نے کئی سال کے
بعد اس سورت کا آخری حصہ نازل کیا، اور یہی مصلحت عمومی کا اقتضا بھی تھا، اگر ابتدا ہی میں یہ ٹکڑا نازل
ہو گیا ہوتا تو آپ وہی کہتے جو ورقہ بن نوفل سے کہا تھا، مگر تنزیل وحی والہام میں ہمیشہ ضرورت
اور وقت کا لحاظ کیا جاتا ہے، اور اس میں یہی ہوا۔

القدر

(آیات، ۵)

تلخیص مضامین

اس سورۃ میں لیلۃ القدر کے فضائل و برکات بیان کرکے بتایا ہے کہ اسی شب میں قرآن کا نزول ہوا ہے، اور اس نے اس شب کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے، پس اگر تم اس کتاب عزیز اور حبل اللہ الجلیل سے تمسک و اعتصام کروگے تو ان تمام صفات و مختصات کو حاصل کرلوگے جو اس شب کی بیان کی گئی ہیں۔



العروۃ الوثقیٰ

شب قدر کی بزرگی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (۱) إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۲) وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۳) لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ (۴) تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ (۵) سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔

ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا، اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے، شب قدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے، اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں، یہ رات طلوع صبح تک امان اور سلامتی ہے۔

دنیا کی بقا مادیات و روحانیات کی آویزش پر ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس تصادم اور کشمکش میں ملکیت پر بہیمیت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس وقت چاروں طرف فسق و فجور کا بازار گرم ہو جاتا ہے، پس یکایک اللہ کی رحمت بھی جوش مارتی ہے اور پھر روحانیت کو مادیت پر غلبہ نصیب ہو جاتا ہے، گویا دوسرے الفاظ میں کبھی موسم بہار سے قلوب و افکار میں تر و تازگی پیدا ہوتی ہے اور کبھی خزاں کے جھونکے ان کو پژمردہ کر دیتے ہیں۔

نبی کی بعثت قوم کے لیے بہار کا حکم رکھتی ہے، اس کی وجہ سے نزول روحانیت ہوتا ہے اور تمام لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے، مگر جب اس کی تعلیم سے انحراف شروع ہو تو پھر خزاں

اپنا اثر دکھاتی ہے، اور قولے عملیہ پر عالم ممات طاری ہو جاتا ہے، اس موت کے بعد نئی زندگی دینے کے لیے دوسرا نبی بھیج دیا جاتا ہے، جس شب کو اس قسم کی روحانیات کا نزول ہو اس کو لیلۃ القدر کہتے ہیں۔

نزول قرآن

اسی شب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا کہ نوع انسانی کی رشد وہدایت کا باعث ہو لتخرج الناس من الظلمت الی النور، ظاہر ہے کہ قرآن مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا، اور اسکی تکمیل میں ۲۳ سال لگ گئے، یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ یہ کتاب عزیز پہلی مرتبہ رمضان میں شب قدر کو نازل ہوئی، گذشتہ سورۃ سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اولین الہام کونسا ہوا، اور اس سورت سے اس کی ابتدا کا پتہ لگ گیا، چنانچہ قرآن کی دوسری آیات بھی اسی کی تصدیق کرتی ہیں، سورۂ بقرہ میں ہے: شہر رمضان الذی انزل فیہ القران ہدی للناس وبینٰت من الہدی والفرقان (۲: ۱۸۵) روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے، جس میں قرآن اول اول نازل ہوا جو لوگوں کا راہ نما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کو الگ الگ کرنے والا ہے، سورۂ دخان میں ہے: انا انزلنہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین فیہا یفرق کل امر حکیم امرًا من عندنا انا کنا مرسلین رحمۃ من ربک انہ ہو السمیع العلیم (۴۴: ۳ تا ۶) ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا، ہم تو رستہ دکھانے والے ہیں، اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصل کیے جاتے ہیں، یعنی ہمارے ہاں سے حکم ہو کر، بے شک ہمیں پیغمبر کو بھیجتے ہیں، یہ تمہارے پروردگار کی رحمت ہے، وہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔

جمہور امت کا اتفاق ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں، اور اس کے آخری دس روز کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔

خصوصیات شب

جس طرح موسم بہار نباتات میں نئی روح پھونک دیتا ہے، اسی طرح یہ شب روحانیات کے نزول کے لیے مخصوص ہے، اس ایک شب میں عبادت کا اجر و ثواب ایک ہزار ماہ کی عبادت کے برابر ہے، اس میں ملائکہ زمین پر نازل ہوتے ہیں، جو یکسر خیر و برکت ہوتے ہیں اور اس لیے تمام کائنات ارضی ایک بقعہ رحمت بن جاتی ہے، یہ دلفریب و کیف پرور نظارہ طلوع فجر تک رہتا ہے

تنبہ و اعتبار

لسان الٰہی نے اس شب کی اعلیٰ ترین خصوصیت یہ بتائی کہ ہزار ماہ سے بہتر یہ ایک شب ہے احادیث میں اس کے تلاش کرنے کی خاص طور پر تاکید ہے، مگر بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص تمام عمر اس کی جستجو میں رہے اور وہ کامیاب نہ ہو، اس لیے خدا نے اس شب میں قرآن نازل کیا جس نے اس کی تمام برکتوں اور رحمتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا پس جب کبھی دنیا میں روحانیت کا تنزل ہوگا تو اس کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے جس قدر خارجی اعانت کی ضرورت ہوگی اس کو صرف قرآن حکیم ہی پورا کر سکے گا، اور شب قدر کے نہ پانے والے جب اس کتاب عزیز سے تمسک و اعتصام کر لیں گے تو وہ ان تمام فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوں گے جو اس شب کے لیے مخصوص ہیں، کیونکہ قرآن اسی رات میں نازل ہوا اور اس نے اس کی تمام خیر و برکت کو اپنے اندر لے لیا، فھل من مدکر۔

البینہ

(آیات ۸)

تلخیص مضامین

اہل کتاب اور مشرکین کی اصلاح ناممکن ہے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث نہ کیا جائے، جو وہی اصول و کلیات، اور عقائد و یقینیات ان کے سامنے پیش کریں گے جن پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے آخر سورۃ میں مخالفین اور موافقین کے نتائج ذکر کر دیئے اور اسی پر سورت کو ختم کر دیا۔



نبی الانبیا کی ضرورت

تقسیم مذاہب

اسلام سے قبل دنیا میں جس قدر مذاہب تھے، ان کو دو طرح پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) جن لوگوں نے علی الاعلان بت پرستی شروع کر دی، اور بعض اشیاء کو مظاہر الٰہیہ مان کر بت بنا لیے، لسان شرع میں ان سب کو مشرکین کہا جائے گا، اگرچہ فی الحقیقت ان کے پاس ابتدا سے کوئی مذہب موجود ہو، اور اس میں صحیح بات بھی پائی جائے، جیسے ہندو اور کفار مکہ۔

(ب) جن مذاہب میں بت پرستی حرام ہے، ان کو اہل کتاب کہا جائے گا، اگرچہ ان کے عام لوگوں میں ایک درجہ شرک کا موجود ہو، مگر انھیں بت پرست اور مشرکین نہ کہا جائے گا چنانچہ آریہ اسی صنف میں داخل ہیں کیونکہ ان کے مذہب میں بت پرستی حرام ہے۔

مشرکین عرب کا دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی کے پابند ہیں، اگرچہ ان میں حج اور قربانی وغیرہ کے رسوم اب تک موجود تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مذہب کو کلیۃً چھوڑ کر بت پرست بن گئے تھے یہاں تک کہ ابراہیم و اسمٰعیل کے بت بھی بیت اللہ میں موجود تھے اور وہ گھر جو صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے مخصوص تھا، اب تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن بن گیا تھا۔

اہل کتاب کی بھی یہی حالت تھی، عہد عتیق و جدید کے باوجود اعمال کفریہ کا ارتکاب کرتے

اور عزیر و عیسیٰ کو خدا کا حقیقی بیٹا کہتے تھے، اسی قسم کی دوسری مشرکانہ رسوم بھی انہیں جڑ پکڑ چکی تھیں اور یہ کفر و الحاد اس درجہ ان میں جاگیر ہو گیا تھا کہ معمولی قوت تجدید سے انکی اصلاح غیر ممکن تھی، اس لیے ایک موسس و مصلح اعظم کی ضرورت تھی جو ان دور از عقل عقائد کو بالکل نیست و نابود کر دے۔

رسول من اللہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ (۲) رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً (۳) فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ۔

جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک وہ کفر سے باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل نہ آتی، یعنی خدا کے پیغمبر جو پاک اوراق پڑھتے ہیں، جن میں مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔

رسول اللہ کی تشریف آوری سے قبل تمام مذاہب میں تحریف ہو چکی تھی، عقائد بگڑ گئے تھے، اعمال صالحہ کا نام و نشان نہ تھا، کتب سماویہ پس پشت ڈال دی گئی تھیں، اکثر تو جزائے اعمال ہی کا انکار کرتے، اور جو تسلیم کرتے تھے انہوں نے کفارہ کو اپنی آڑ بنا لیا تھا، تمام ناشائستہ حرکات کا ارتکاب ہوتا اور دعوی یہ کیا جاتا کہ مذہب کا یہی حکم ہے۔

جب ایک جماعت کسی غلط سے غلط کام کو مذہب کے نام سے کرتی اور ثواب کی امیدوار ہوتی ہے؛ تو پھر اس کی اصلاح مجدد کے لیے غیر ممکن ہے، اس لیے کہ جس قدر قوت کے ساتھ وہ فسق و فجور پر قائم ہے جب تک اسی درجہ کاری ایکشن اور رد عمل نہ ہو گا اصلاح نہ ہو سکے گی چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کئی مجددین ملت عیسوی میں پیدا ہوئے مگر نصاریٰ کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی مشرکین کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

پس جب کائنات ارضی انسانوں کے فسق و فجور سے ظلمت و تاریکی کا گھر بن گئی تھی، اور حق کی روشنی بجھ گئی تھی تو وقت آگیا کہ آخری رسول کا آفتاب فاران کی چوٹیوں پر طلوع کرے، دعائے خلیل کو شرف قبول نصیب ہو اور مسیح نے جس آنیوالے کی بشارت دی تھی اس کے آنے کی خوش خبری سنکر بنی آدم عبرت اندوز و بصیرت افروز ہوں اور حق و صداقت کی پیروی کریں۔

آپ ہی کا وجود اقدس وہ روشن دلیل ہے جس نے آتے ہی اوہام و ظنون کے پردے چاک چاک کر دیئے سلاسل و اغلال رسوم کو توڑ دیا اور سب کو ظلمت سے نکال کر روشنی میں لے آئے بینہ کی تفسیر خود آگے رسول من اللہ سے کر دی ہے، اس رسول کا یہ فرض ہوگا کہ وہ لوگوں کے سامنے پاک صحیفوں کی تلاوت کرے۔

کتب قیمہ کے متعلق بعض مفسرین کرام یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد صحف انبیائے عظام ہیں یعنی رسول انھیں اصول و کلیات کی تعلیم دیں گے جو تمام صحائف و اسفار آسمانی میں دیے گئے تھے، اور جن سے ایک نبی نے بھی اختلاف نہیں کیا، نوح سے لے کر محمد علیہم السلام تک کی دعوت ایک ہی تھی۔

دوسرے لوگوں کی یہ رائے ہے کہ کتب قیمہ سے مراد قرآن کی مختلف سورتیں ہیں، اس لیے کہ ہر ایک سورہ مستقل کتاب قیم ہے، یہ قتادہ کی رائے ہے، ہماری رائے میں دونوں قول ٹھیک ہیں؛ قرآن وہی اصول پیش کرتا ہے جو پہلی کتابوں میں مذکور تھے، مگر لوگوں نے ان کو فراموش کر دیا، اسی لیے آپ کو مذکر یاد دلانے والا کہا گیا ہے، قرآن کی مختلف سورتوں میں وہی کلیات ذکر کیے گئے ہیں جن پر تمام مذاہب متفق ہیں؛ اس لیے آپ اہل کتاب اور مشرکین کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں کہ انھیں وہ باتیں یاد آجائیں، اور اس طرح تمام ادیان ایک عالم گیر برادری میں شامل ہو جائیں۔

اختلاف کیوں ہوا

(۴) وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ۔ اور اہل کتاب جو متفرق و مختلف ہوئے ہیں تو دلیل واضح آنے کے بعد ہوئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے مشرکین پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ شدید ترین غلطیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں اور ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس رسول کا اتباع نہ کریں، یہود و نصاریٰ کو آپ کی صداقت کا ایسا ہی علم تھا جس طرح انھیں اپنی اولاد کا یقین تھا: یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم، مگر باوجود اس کے یہ لوگ بھی آپ پر ایمان نہ لائے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اہل کتاب کے پاس اللہ کے رسول قبل ازیں آچکے تھے جنھوں نے صحیح تعلیم ان کے سامنے پیش کر دی تھی مگر انھوں نے ان انبیاے کرام کو بھی نہ مانا بلکہ ان کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کے بجاے اختلاف میں پڑ گئے، ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے، بعض اجزاے کتاب کو لے لیا اور دوسرے حصص کا انکار کر دیا، تلبیس الحق بالباطل کے مرتکب ہوئے اور اس طرح ضروری اور غیر ضروری کو خلط ملط کر کے اصل کتاب ہی کو بے کار کر دیا، اب وہ کتاب اس قابل نہیں رہی کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ان حالات میں یہ ظاہر ہے کہ کوئی پرانی کتاب آسمانی انسانوں کی رہ نمائی کا فرض ادا نہیں کر سکتی، بلکہ جدید پیغمبر اور نئی کتاب کی ضرورت ہے جو عالم گیر اصول و کلیات کی طرف انسانوں کو دعوت دے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ضروری ہے۔

کیا تعلیم تھی

(۵) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا اور ان کو حکم تو یہی تھا کہ اخلاص عمل کے ساتھ خدا کی عبادت کریں، ایک سو ہو کر، اور نماز پڑھیں

الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ۔ اور زکوٰۃ دیں، اور یہی سچا دین ہے۔

حنفا، جمع حنیف کی ہے، اُس شخص کو کہتے ہیں جو تمام مذاہب سے الگ ہو کر دین اسلام کی طرف رجوع کرے، لغت میں اس کے معنی میلان کے آتے ہیں، عرف میں یہ میلان الی الخیر کے لیے مخصوص ہے، اور اب اس کے یہ معنی ہیں کہ یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، اور شرک سے الگ ہو کر اسلام کا پابند ہونا۔

ان اہل کتاب کو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ خدا اور بندوں کے تعلقات درست رکھیں، خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں، سب سے کٹ کر اسی کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیں، اور لوگوں کو مختلف نہ ہونے دیں، بلکہ ان کو ایک لڑی میں پرو لیں، اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ مل کر نماز پڑھیں تاکہ قوم میں نظم و ترتیب قائم رہے، اور اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے زکوٰۃ دیا جو ان کی اصلاح میں صرف ہو گی، مگر ان لوگوں نے ان احکام کو پس پشت ڈال دیا، اور اپنے اباطیل و اکاذیب کو مذہب کا نام دے کر ان پر عمل کرنے لگے، جب اہل کتاب کی یہ حالت ہو تو مشرکین تو ان سے کہیں زیادہ خراب ہوں گے کہ ان کے پاس نہ کوئی پیغمبر آیا نہ آسمانی کتاب۔

مخالفین کا انجام

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا، اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ

جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک، وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے، اور ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ لوگ سب مخلوق سے بدتر ہیں۔

برأ کے معنی خلق، اور بریۃ مخلوقات۔ کفار، مشرکین، اور اہل کتاب کے باہمی اختلاف کے وقت اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا، اور اگر

اب بھی یہ لوگ آپ کی تعلیم کو نہ مانیں تو ان سے بڑھ کر اور کون بدبخت ہو سکتا ہے، جس کا نتیجہ جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

رضی اللہ عنہم

(۷) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے،
اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (۸) جَزَآؤُهُمْ	وہ تمام خلقت سے بہتر ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ	کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا،	بہ رہی ہیں، ابدالآباد ان میں رہیں گے، خدا ان سے
رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ	خوش اور وہ اس سے خوش، یہ صلہ اس کے لیے ہے جو
لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ۔	اپنے پروردگار سے ڈرتا رہا۔

مگر جن لوگوں نے اپنی قوت نظری اور عملی دونوں کی تکمیل کی، ان کا شمار اشرف ترین مخلوقات میں ہوگا، وہ جنت کے وارث ہوں گے، جہاں اعلیٰ ترین نعمتیں موجود ہوں گی، ان ارباب قدس و طہارت کی سب سے بڑی فضیلت و بزرگی یہ ہوگی کہ اللہ ان سے راضی ہوگا، اور وہ اپنے پروردگار سے راضی، کہ اس نے محض اپنے فضل سے ان کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو قبول اور ان کی دعاؤں کو شرف اجابت بخشا، اور اللہ کے خوف سے ان لوگوں کی گردنیں اس کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکیں۔

الزلزال

(آیات ، ۸)

تلخیص مضامین

اس سورت کی ابتدائی آیات میں قیامت کے ان حوادث کا ذکر کیا گیا ہی جو شروع میں رونما ہوں گے، پھر اس خوفناک حادثہ کا انجام یہ ہوگا کہ تمام بنی آدم اپنے اپنے اخلاق و اعمال کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں تقسیم ہوجائیں گے، اس روز کی کیفیت یہ ہوگی کہ کوئی چیز بھی مخفی نہ رہ سکے گی، بلکہ اگر حقیر ترین نیکی یا بدی کی ہی تو وہ بھی سامنے آجائیگی

واقعات قیامت

زلزلہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَھَا (۲) وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَھَا (۳) وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَھَا۔

جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی، اور زمین اپنے اندر کے بوجھ نکال ڈالے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا ہے۔

حادثہ قیامت کی ابتدا جن واقعات سے ہوگی، ان کا کچھ تھوڑا سا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے، تمام صحیح احادیث اور موجودہ زمانہ کی تحقیقات اس حقیقت پر مہر لگاتی ہیں کہ قیامت کی ابتدا زلازل سے ہوگی، اور ان کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین میں جس قدر خزائن و دفائن اور دوسری چیزیں مخفی ہیں سب کی سب ان جھٹکوں کی وجہ سے باہر آجائیں گی، چنانچہ یہ روزمرہ کے مشاہدات ہیں کہ جن مقامات میں زلزلوں کی کثرت ہے، وہاں سب مدفون چیزیں باہر آجاتی ہیں، حدیث میں آتا ہے: تلقی الارض افلاذ کبدہا امثال الاسطوان من الذہب والفضۃ فیجئ القاتل فیقول فی ہذا قتلت ویجی القاطع فیقول فی ہذا قطعت رحمی ویجی السارق فیقول فی ہذا قطعت یدی ثم یدعونہ فلا یاخذون منہ شیئاً (مسلم) زمین اپنے جگر کے ٹکڑے نکال دیگی چاندی اور سونے کے ستونوں کی طرح یہ ٹکڑے ہوں گے، قاتل دیکھ کے کہے گا کہ میں نے اس کے لیے قتل کا ارتکاب کیا، قطع رحم والے نے اسی کے لیے عزیزوں کو ترک کیا تھا، اور اسی کے لیے چور کا ہاتھ کاٹا گیا، پھر ان سے کہا جائے گا کہ لے لو، مگر وہ کچھ بھی نہ لیں گے۔

ان تمام تغیرات و انقلابات کو دیکھ کر انسان حیران و پریشان ہوگا، وہ کہے گا کہ میرے آرام کی جگہ تو فنا ہوگئی اب میں کہاں جاؤں! اور یہ سب کچھ کیا ہوگیا۔

حکم خداوندی

(۴) یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (۵) بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا۔
اس روز وہ اپنے حالات بیان کردے گی کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا۔

یہ تمام کائنات ارضی و سماوی تو صرف انسان ہی کے لیے ہے جب یہی نہ رہا جس کے لیے ہر چیز کی تخلیق عمل میں آئی تھی تو اب ان تمام چیزوں کا رشتہ بھی اس سے ٹوٹ جائے گا اور ایک روحانی قوۃ کے اثر سے ان میں سے ہر چیز کے اندر قوت گویائی پیدا کردی جائے گی، زمین کو بھی یہ قوت نوازش ہوگی اور اس الہام ربانی کی بدولت وہ ان تمام اعمال کو بیان کردیگی جو اسکی پشت پر ابن آدم نے کیے ہیں

مختلف گروہ

(۶) یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (۷) فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ (۸) وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۔
اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے، تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں، تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

دنیا میں انسانوں کے باہمی تعلقات شعوب و قبائل اور خاندانوں کے اعتبار سے تھے، مگر مرنے کے بعد یہ نظام جاتا رہے گا، اور اس کی جگہ تعلقات کی نئی صورت قائم ہوگی، اس وقت باہمی ربط و تعلق کا ذریعہ انسان کے اعمال و اخلاق ہوں گے، درمیان میں سے زمانہ کا سوال اٹھا دیا جائے گا، اور اغراض و مقاصد کے اعتبار سے لوگوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا: لا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون۔

انسانی اعمال کا ادنیٰ ترین حصہ بھی ضائع نہیں جاتا، اس لیے قیامت کے روز ہر شخص اپنی نیکی اور بدی بلا کم و کاست دیکھ لے گا، اس کے بعد فیصلہ ہوگا جس کا تذکرہ سورۂ قارعہ میں ہے۔

العادیات

(آیات ۱۱)

تلخیص مضامین

ابتدائی پانچ آیات میں گھوڑے کی مختلف حالتوں سے استدلال کر کے بتایا کہ انسان خدا کا شکر ادا نہیں کرتا، آیت ۸ میں اس ناشکرگذاری کے اسباب پر بحث کی، اور خاتمہ میں تذکیر ما بعد الموت سے انسان کو توجہ دلائی کہ وہ اپنی اصلاح کرے۔



ان الانسان لربہ لکنود

گھوڑوں کی شہادت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا (۲) فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۳) فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا (۴) فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا (۵) فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا۔

ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں، پھر پتھروں پر نعل مار کر آگ نکالتے ہیں پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں پھر اس میں گرد اٹھاتے ہیں پھر اس وقت دشمن کی فوج میں جا گھستے ہیں۔

عادیات جمع ہے عادیۃ کی یہ عدو سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوڑنے کے ہیں، ضبح وہ آواز جو دوڑتے وقت گھوڑے کے موتھ سے نکلتی ہے جسے ہانپنا کہتے ہیں، موریات جمع ہے موریۃ کی، اور اس کی اصل ایرا ہے: آگ نکالنا، قدح آگ نکالنے کے لیے مارنا، مغیرات جمع ہے مغیرۃ کی، دشمن کو قتل کرنے یا اس کا مال لوٹنے کی غرض سے اس پر حملہ کرنا، اثرن ماخوذ ہے اثارت سے غبار کو حرکت دینا اور اڑانا، نقع غبار کو کہتے ہیں، فوسطن، دشمن کی فوج میں جا گھستے ہیں۔

قرآن کے اولین مخاطب عرب ہی تھے، ان ہی کی زبان میں نازل ہوا اور انھیں کی رسوم وعوائد پر اس نے عمیق ترین نظر ڈالی، اگرچہ دنیا میں ہر جگہ گھوڑے کو عزیز رکھتے ہیں، مگر ایک عرب کے نزدیک یہ جانور عزیز ترین ہے، یہی اس کی جائداد اور یہی اس کی اولاد ہے، اس لیے کہ عرب فطرۃً آزاد اور شاہسوار پیدا ہوا ہے، زندگی کے ہر لمحہ میں وہ اس کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے،

وہ جب اس پر سوار ہوتا ہے تو گھوڑے کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اپنے مالک کی اطاعت و فرمانبرداری میں اس قدر تیز بھاگتا ہے کہ دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگتا ہے یہاں تک کہ پتھروں میں سے آگ نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔

تمام دنیا آرام میں ہوتی ہے، پرندے اپنے آشیانوں ہی میں ہوتے ہیں، مگر صرف یہ ایک وفادار و اطاعت شعار حیوان ہے جو اپنے مالک کی خوشنودی مزاج اور حق خدمت گذاری ادا کرنے کے لیے اپنے آرام و راحت کو ترک کرتا، اور عین صبح کے وقت دشمن پر حملہ آور ہوتا ہے، سوار کے اشاروں پر کبھی ایک طرف دشمن کی صف کو الٹ دیتا ہے اور کبھی دوسری جانب کثرت غبار کی وجہ سے زمین و آسمان کو ایک کر دیتا ہے۔

وہ جانتا ہے کہ موت سامنے کھڑی ہے، مگر اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ میرے مالک نے عین شدّت بھوک و پیاس میں دانہ اور پانی دیا ہے، اس لیے میری سب سے بڑی سعادت و نیک بختی یہی ہے کہ اپنے مالک کا ہر حکم مانوں، اس لیے وہ عین اس وقت دشمن کی فوج میں گھس جاتا ہے جب تلواریں ایک دوسرے کے خون سے رنگین ہوں کہ اگر دم نکلے تو مالک کی وفاداری ہی میں نکلے۔

انسان کی ناشکری

(۶) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۷) وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ۔ کہ انسان اپنے پروردگار کا احسان ناشناس اور ناشکرا ہے اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔

تم گھوڑے کی ایک ایک وفاشعاری پر غور کرو، اُس کے مالک نے جسم و جان عطا نہیں کی اس نے چند سکوں کے عوض میں اسے خریدا ہے اس کا احسان یہ ہے کہ اس نے دانہ اور پانی دیا ہے مگر اس تھوڑے سے احسان کے عوض میں تم دیکھو کہ وہ حیوان لایعقل اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے

یہ تو ایک حیوان کا حال تھا، اب تم انسان کو دیکھو جو اشرف مخلوقات ہے جس کے پاس جو کچھ ہے

خدائے قدوس کی بخشش ہے، تم گھوڑے کی قربانی اور انسان کے اعمال کا مقابلہ کرو تو خود بخود دیکھ لو گے کہ فرزند آدم خدا کا بڑا ہی ناشکر گذار ہے۔ یہ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ صرف گھاس اور پانی دے کر تم تو گھوڑے سے اتنا کام لو کہ اس کی جان تک نکل جائے اور تم خالق ارض و سما کا ذرہ برابر بھی شکر ادا نہ کر سکو جس نے تمہیں ہر چیز نوازش فرمائی ہے۔

ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے جرائم کی عذر خواہی کر سکتا ہے اور اپنے معاصی کو چھپا سکتا ہے مگر جب وہ سب سے الگ ہو کر اپنے گریبان میں مونھ ڈالتا ہے، خدا کی نعمتوں اور اپنی سرکشی کو دیکھتا ہے تو پکار اٹھتا ہے کہ واقعی میں خدا کا سخت ناشکر گذار ہوں: بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ (۷۵: ۱۴ و ۱۵) بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے، اگرچہ عذر و معذرت کرتا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: قل ہوالذی انشاکم وجعل لکم السمع والابصار والافئدہ قلیلا ماتشکرون (۶۷: ۲۳) وہ خدا ہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے مگر تم کم احسان مانتے ہو۔

انسان اس گھوڑے سے سبق اندوز ہو اور کم از کم اتنی قربانی تو کرے جتنی یہ جانور کرتا ہے، گھوڑے کی سواری سیکھے، تلوار و بندوق کے استعمال سے واقف ہو، جدید ترین آلات حرب میں درخور وافی حاصل ہو، اور اسلام و امت مسلمہ کی حفظ و صیانت کے لیے ہر وقت پا در رکاب ہے۔

مرض کا سبب

(۸) وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ۔ وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔

اس آیت میں گذشتہ مرض ناشکر گذاری کا سبب بتایا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس نے جمع مال و دولت ہی کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی بنا لیا ہے، اس کے کسب و حصول میں نہ تو وہ کسی قانون کی پروا کرتا ہے، اور نہ اخلاق و مروت کی، وہ ہر جائز و ناجائز طریق سے روپیہ سمیٹتا اور اپنے صندوق میں بند رکھنا چاہتا ہے کہ لوگ اسے دولت مند کہیں اس کی دولت سے نہ اس کے خاندان کو فائدہ

پہنچاتا ہے، نہ ملک و ملت کو پھر یہ مال کس کام کا۔

خیر سے مال مراد ہے جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے قرآن میں کئی جگہ خیر کا اطلاق دولت ہی پر آیا ہے:
کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ (۲: ۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت
کا وقت آجائے تو اگر وہ مال چھوڑ جانے والا ہو تو وہ وصیت کر جائے۔ دوسری جگہ آیا: وما تنفقوا من خیر
فلانفسکم وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون (۲: ۲۷۲) تم جو مال خرچ کرو گے
تو اس کا فائدہ تمہیں کو ہے اور تم تو جو خرچ کرو گے خدا کی خوشنودی کے لیے کرو گے اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ تمہیں
پورا پورا دیدیا جائے گا، اور تمہارا کچھ نقصان نہ کیا جائے گا۔

غلط فہمی کا ازالہ

اس آیت میں انسان کی ناشکر گذاری کا سبب اس کا مال و دولت کو جمع کرنا بیان کیا گیا ہے اس سے
یہ شبہہ ہو کہ قرآن حصول دولت کو گناہ قرار دیتا ہے اور اسلام کے نزدیک وہ بیجا ناجائز ہے یہ خیال بالکل غلط
ہے قرآن نے آتے ہی سب سے اول رہبانیت کو مٹایا جو صدہا معاصی و جرائم کا ذریعہ بن گئی تھی اور لیس للانسان
الا ما سعی کا اصول قائم کر کے بتا دیا کہ ہر شخص کو اپنی دنیوی و اخروی زندگی کے بقاء و قیام کے لیے خود کوشش
کرنی چاہیئے، وہ کسی کے لیے بار دوش ثابت نہ ہو، سورہ نساء میں فرمایا: ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل
اللہ لکم قیاما (۴: ۵) دنیا میں قوموں کی زندگی کا عظیم ترین راز اسی دولت میں پنہاں ہے اس لیے بے عقلوں
کو اپنا مال جسے خدا نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا ہے مت دو، آیات سابقہ میں مال و دولت پر لفظ خیر
کا اطلاق خود اسی حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ شریعت کی نظر میں وہ ایک عمدہ اور خیر و برکت کی چیز
ہے اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسے خوب کمائے۔

البتہ قرآن اس دولت کو غضب الٰہی اور دخول جہنم کا سبب بھی قرار دیتا ہے، جب تک قوم و ملک و
اعلائے کلمۃ الحق کے لیے صرف کی جائے سورہ توبہ میں آتا ہے: والذین یکنزون الذہب والفضۃ ولا ینفقونہا

فی سبیل اللہ فبشرہم بعذاب الیم یوم یحمیٰ علیہا فی نار جہنم فتکوی بہا جباہہم وجنوبہم وظہورہم، ہٰذا ماکنزتم لانفسکم فذوقوا ماکنتم تکنزون (۹: ۳۴ و ۳۵) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں، اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُن کو اس دن کے عذاب الیم کی خوشخبری سُنا دو جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی جبینوں کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی، اور کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، سو جو تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

تذکیر بما بعد الموت

(۹) أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ (۱۰) وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ (۱۱) إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ۔ کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا کہ جو مردے قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے اور جو بھید دلوں میں ہیں وہ ظاہر کر دیئے جائیں گے بیشک ان کا پروردگار اس روز بھی ان سے خوب واقف ہے۔

ان آیات میں اس مرض کا علاج بتایا گیا ہے جس انسان کی سرکشی اور تمرد کی یہ کیفیت ہو کہ وہ مال و دولت کے غرور باطل میں اپنے فرائض انسانیت کبھی فراموش کر چکا ہو اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کو تعلق باللہ کا خیال نہیں آتا وہ اپنے انجام اور عاقبت کار پر بھی غور کر لے وہ آج اپنے اعمال و اخلاق کی توجیہ لوگوں کے سامنے کر سکتا ہے، مگر اُسے وہ وقت بھی یاد کر لینا چاہیے جس روز اس کے تمام سرائر و محجوبات عالم آشکارا ہو جائیں گے اور باوجود کمال سعی و کوشش کے وہ اُنکو چھپا نہ سکے گا: یومئذ تعرضون لاتخفی منکم خافیہ (۶۹: ۱۸) اس روز تم سب لوگوں کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہ رہے گی۔

تم دنیا ہی سے اپنی ناشائستہ حرکات چھپاتے تھے اس لیے اُنہی کے سامنے تمہارے تمام عیوب ظاہر کر دیے جائیں گے اللہ تو اس وقت بھی تمہارے ہر ایک کام سے واقف ہے مگر وہ فوراً مواخذہ نہیں کرتا بلکہ تمہیں مہلت دیتا ہے کہ شاید تم اپنی اصلاح کر لو پس جو شخص مال کی محبت میں اس درجہ منہمک ہے وہ اس کے نتائج پر بھی غور کر لے اور اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کو فراموش نہ کرے۔

القارعة

(آیات، ۱۱)

تلخیص مضامین

قیامت کی تصویر کھینچکر بتایا گیا کہ انسانوں کو اس روز دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جائیگا۔ فمنہم شقی وسعید۔ ایک گروہ جو اپنے اعمال صالحہ کی وجہ سے جنت کے وارث ہوں گے اور دوسرے گروہ جو اپنے فسق وفجور کی پاداش میں جہنم واصل ہوں گے۔

یوم التغابن

تباہی عالم

بسم اللہ الرحمن الرحیم (۱) اَلْقَارِعَۃُ (۲) مَا الْقَارِعَۃُ (۳) وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَۃُ (۴) یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (۵) وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ۔

کھڑکھڑانے والی کھڑکھڑانے والی کیا ہی، اور تم کیا جانو کہ کھڑکھڑانے والی کیا ہی، وہ قیامت ہی جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوے پتنگے اور پہاڑ ایسے ہو جائینگے جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اون۔

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام قارعہ ہی جس کے معنی کھڑکھڑانے والی ہی، کیونکہ ہر شخص کا دل اس کی دہشت کی وجہ سے دھڑکتا ہوگا، فراش پتنگے کو کہتے ہیں، جو شب کے وقت چراغ کی روشنی پر گرتا اور جل جاتا ہی، وہ اس نور کو دیکھکر حیران و ششدر رہ جاتا ہی اور انجام کو معلوم کیے بغیر جہالت کی وجہ سے اس پر گر کر جل جاتا ہی، قیامت کے روز یہی حال انسانوں کا ہوگا، جو اس روز کی ہولناکی اور خوف سے ادھر ادھر مارے پھرتے ہوں گے اور حیران ہونگے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں، عہن اون کو کہتے ہیں یہی مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ کی رائے ہی، نفش دھننے کو کہتے ہیں، جب نداف اون کو دھنتا ہی تو اس کے تمام بال ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اگر معمولی ہوا بھی چلے تو وہ فوراً ہوا میں اڑتے ہوے دکھائی دینگے، قیامت کے روز پہاڑوں کا یہی حال ہوگا، کثرت زلازل کی وجہ سے ان کے اجزا اس قدر الگ الگ

ہو جائیں گے جس طرح اون کے بال۔

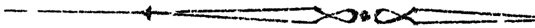
ان آیات میں حادثہ قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے، اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر قائم ہے، مگر قیامت کے روز یہ کشش اتصال جاتی رہے گی اس لیے اس دن ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ کر اڑتی پھرتی نظر آئے گی۔

نتائج اعمال

(۶) فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ (۷) فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۸) وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ (۹) فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (۱۰) وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ۔

تو جس کے اعمال کے وزن بھاری نکلیں گے، وہ دل پسند عیش میں ہوگا، اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے اس کا مرجع ہاویہ ہے، اور تم کیا سمجھتے ہو کہ ہاویہ کیا چیز ہے؛ وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔

اس وزن نتائج کی صورت یہ ہوگی کہ تمام اعمال کو وزن کیا جائے گا، دنیا میں انسان نے ہر چیز کے وزن کرنے کے لیے مختلف قسم کے ترازو بنائے ہیں، سردی اور گرمی معلوم کرنے کے آلات اس ترازو سے بالکل مختلف ہیں جو اناج تولنے کے کام آتی ہے، اس وزن جو ترازو ہوگی وہ اخلاق کی ہوگی، اعمال کی غرض اخلاق فاضلہ کا پیدا کرنا، اور خبیث جذبات کا دور کرنا ہے، پس اس وزن اخلاق کی باٹ میں انسانی اعمال کی جانچ ہوگی، جس شخص کے اخلاق اچھے ہوں گے وہ جنت میں جائے گا، ورنہ اس کے رہنے کی جگہ دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ ہوگی۔



التکاثر

(آیات ۸)

تلخیص مضامین

لوگ ہر چیز کی کثرت کے طالب اور حقیقت سے بالکل بے خبر رہتے ہیں، تا آنکہ موت آجاتی ہے، کاش وہ جانتے کہ اللہ کے نزدیک کثرت مطلوب نہیں، بلکہ وہ جذبات حقہ جو ان سے پیدا ہوتے ہیں، اگر اس حقیقت سے انسان خبردار رہتا تو اپنی آنکھوں سے اسی دنیا میں جنت اور دوزخ دیکھ لیتا، مگر وہ غفلت سے کام لے رہا ہے، اور ان چیزوں کی پروا نہیں کرتا جو اس حقیقت کی طرف اسے متوجہ کرتی ہیں، لیکن قیامت کے روز اس سے انہیں چیزوں کی بازپرس ہوگی۔



حقیقت اعمال

کثرت طلبی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (۲) حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۳) کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۴) ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔

لوگو تم کو بہت سی طلب نے غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں، دیکھو تمھیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، پھر دیکھو تمھیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

الہا، کہتے ہیں لہو کی طرف پھرنا، اور ایک چیز سے غافل ہو جانا، تکاثر کے معنی ہیں کسی چیز کی کثرت پر فخر و مباہات کرنا، عام طور پر لوگ مال، اولاد، اور عزت کی وجہ سے اپنے بھائیوں پر فخر کرتے ہیں، اس لیے تکاثر ان ہی چیزوں کی کثرت طلبی پر بولا جاتا ہے۔

مفسرین نے تکاثر سے مال و اولاد ہی مراد لی ہے، مسلم میں ہے: یقول العبد مالی مالی وانما لہ من مالہ ثلاث، ما اکل فافنی او لبس فابلی او تصدق فامضی، و ما سوی ذلک فذاھب وتارکہ للناس، بندہ تو مال مال پکارتا ہے، حالانکہ اس کا صرف وہ حصہ ہے جو اس نے کھا کر فنا کر دیا، یا کپڑے پہن کر ردی کر دیے، یا اللہ کی راہ میں صدقہ دے دیا، اس کے بعد جس قدر بچ گیا وہ دوسرے لوگوں کا حق ہے، حسن بصری نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ مال و اولاد کی کثرت طلبی نے تم کو بالکل غافل کر دیا۔

حقیقت اعمال

ہمارا خیال یہ ہے کہ تکاثر کا لفظ عام ہے اور اس میں نہ صرف مال اولاد ہی شامل ہیں بلکہ اعمال تک داخل ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کے بعض اطلاقات بیان کیے ہیں مال و اولاد میں بند نہیں کر دیا، قرآن کریم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی نظر اعمال پر نہیں بلکہ ان حقائق و جذبات پر ہوتی ہے جو ان اعمال سے پیدا ہوتے ہیں، قربانی کے متعلق فرمایا: لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم (۲۲: ۳۷) خدا تک نہ اُن کا گوشت پہنچتا ہے، اور نہ خون، بلکہ اُس تک تمھاری پرہیزگاری پہنچتی ہے، نماز کے متعلق آتا ہے: ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر، روزے کی نسبت فرمایا: یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (۲: ۱۸۳) تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔

غرض ان تصریحات سے یہ ہے کہ شریعت کے پیش نظر اخلاق ہیں نہ اعمال، مگر یہ اخلاق نہیں پیدا ہو سکتے جب تک اعمال نہ ہوں، اس لیے شریعت ہر شخص کے لیے چند اعمال کی پابندی لازم کر دیتی ہے، اور اس پابندی میں اعلیٰ ترین، ادنیٰ ترین انسان برابر ہوتے ہیں، قانون ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا، البتہ نتائج کے اعتبار سے دونوں میں عظیم الشان فرق ہوگا۔

مگر دوسری طرف یہ بھی خیال تھا کہ بعض لوگ جہالت کی وجہ سے یہ دعوی نہ کر بیٹھیں کہ ان اعمال کی بنا پر شریعت جن جذبات و حقائق کی طالب ہے وہ ہم میں پہلے ہی سے موجود ہیں، اس لیے ہمیں ان اعمال کی پابندی کی ضرورت نہیں، تو اس کا سد باب کرنے کے لیے قرآن نے کہا: ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، ان اللہ علیم خبیر (۴۹: ۱۳) خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، بے شک خدا سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبردار ہے، پس جب ان حقائق سے اللہ کے سوا اور کوئی خبردار نہیں تو اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ انسان ان اعمال کی

پابندی کرتا ہے، مگر اس کی اصل نظر جذبات و اخلاق پر ہو۔ حدیث میں آتا ہے: خیر العمل ما داوم علیہ صاحبہ وان قل، بہترین عمل وہ ہے جو اگرچہ تھوڑا ہو مگر بلا ناغہ ہوتا رہے کہ اس کا اثر یقیناً اخلاق پر پڑے گا۔

رجوع الی المقصود

اس قدر تمہید کے بعد اب آپ ان آیات میں غور کریں، ان کا مطلب بالکل صاف ہے، تم لوگوں پر ہر چیز کی کثرت طلب اس درجہ غالب آگئی ہے کہ اب تم ان حقائق و جذبات سے بالکل غافل ہو گئے ہو جو شریعت کے پیش نظر ہیں، اور یہ مرض تم میں اس قدر جاگیر ہو گیا ہے کہ مرتے دم تک اس میں مبتلا رہو گے، تم اس گمان باطل میں ہو کہ محض کثرت ہی تمہیں دنیا و آخرۃ میں کامیاب کر دیگی اگرچہ تم میں اخلاق نہ ہوں، مگر یہ خیال بالکل غلط ہے، تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک شدید ترین غلطی تھی۔

اس کی ایک نظیر تمہارے سامنے ہے، مہاجرین و انصار ظاہری اشکال و صور پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ان کی روح و حقیقت کا بھی خیال رکھتے تھے، اس لیے جلد تر کامیاب و بامراد ہو گئے، مگر ایک جماعت منافقین کی بھی تھی، جو ان تمام اعمال صالحہ کی پابند تھی جن کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے، مگر حقیقت سے بالکل دور تھی، اس لیے جلد برباد ہو گئی، اور ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار کی مستحق قرار پائی۔

اگر ان مثالوں سے تمہاری چشم بصیرت نہیں کھلتی تو مرنے کے بعد تم خود دیکھ لو گے کہ اللہ کو کثرت مطلوب نہ تھی۔

اگر حقیقت پیش نظر رہتی

(۵) كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ (۶) لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (۷) ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ۔

دیکھو اگر تم جانتے یعنی علم الیقین رکھتے تو غفلت نہ کرتے، تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے، پھر اس کو ایسا دیکھو گے کہ عین الیقین آجائے گا۔

اگر تمہیں قرآن پر یقین و اذعان ہوتا، اور رسول اللہ کی تعلیمات کو صحیح سمجھتے تو تمہیں معلوم

ہوجاتا کہ شریعت میں اعمال کی صرف ظاہری صورتوں ہی کا لحاظ نہیں کیا گیا، بلکہ اس کی نظر ہمیشہ حقیقت و اصلیت پر رہی ہے، اگر تم اپنے اعمال میں اس کا خیال رکھتے تو تمہاری یہ حالت ہوتی کہ دوزخ ان آنکھوں سے دیکھ لیتے، اور تمھیں معلوم ہوجاتا کہ عالم آخرت میں حقائق و ارواح کی قدر و قیمت ہے: ان اللہ لا ینظر الی صورکم واعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم ونیاتکم، اللہ تمہاری صورتوں اور عملوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس کی نظر قلوب و نیات پر ہوتی ہے اور اگر رسول اللہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی نتائج اعمال کا تمھیں یقین نہ ہو تو یاد رکھو مرنے کے بعد اپنی آنکھوں سے عذاب الٰہی کا مشاہدہ کروگے۔

نعمت کا مطلب

(۸) ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔ پھر اس روز تم سے نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی۔

روایات میں آتا ہے کہ ابن مسعود نعمت سے مراد امن و صحت لیتے ہیں، ابن عباس کے نزدیک تندرستی اور کھانے پینے کی ہر چیز ہے، بعض لوگ آنکھ اور کان مراد لیتے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ ابوبکرؓ اور عمرؓ ایک انصاری کے باغ میں گئے انھوں نے گوشت، کھجوریں اور ٹھنڈا پانی پیش کیا تو آپ نے فرمایا تم سے ان نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

یہ نعمت کے مختلف اطلاقات ہیں، حصر مقصود نہیں، نعمت سے مراد قرآن بھی ہے کہ اس سے بڑھ کر نوع انسانی کے لیے خدا کی اور کونسی نعمت ہوسکتی ہے، اس نے ہم پر واضح کردیا کہ آخرت میں صرف اخلاق کام آئیں گے: الا من اتی اللہ بقلب سلیم ہمنے قرآن جیسی نعمت کو پس پشت ڈال دیا، اور کثرت کی طلب میں حقیقت سے دور جا پڑے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس بھی اس کا مصداق ہوسکتی ہے، آپ ہی کی معرفت فرزندان آدم کو قرآن ملا، غرض یہ ہے کہ نعمت کا لفظ عام ہے کسی ایک معنی میں حصر کرنے کی ضرورت نہیں۔

النصر

(آیات: ۳)

تلخیص مضامین

تاریخ کی شہادت پیش کرکے انسان کے خسران وضلال کو ثابت کیا، اور آخری آیت میں فوز وکامرانیٔ امم کے اہم اصول وکلیات بیان کیے۔



کلید کامرانی

زمانہ کی شہادت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) وَالۡعَصۡرِ ۔ عصر کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے۔

(۲) اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۔

ہر انسان اپنی کوشش میں ناکام ہے، اور نامرادی دنیا و آخرت افراد اور امم سب پر حاوی ہے، یہ دعویٰ ہے جو اس سورت میں کیا گیا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ زمانہ کو دیکھو جب سے زمین و آسمان قائم ہے اور ارض الہی کی پشت پر فرزند آدم آباد ہے، اس وقت سے لیکر آج تک کے حالات کا درس و مطالعہ کرو، ان قوموں کے عروج و زوال کے سوانح و حالات کو گہری نظر سے دیکھو انکی داستان علو و تسفل اوراق تاریخ میں محفوظ و ثبت ہے، اس کو پڑھو، پس عصر کے معنی تاریخ کے ہوئے اور دونوں آیتوں کا ترجمہ یہ ہوا کہ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انسان اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا،

طرق تذکیر

قرآن کریم کے پند و موعظت کے تین طریقے ہیں:

(الف) تذکیر بالاء اللہ، اپنی نعمتیں یاد دلا کر فرائض انسانیت ادا کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے: فاذکروا الاء اللہ۔

(ب) تذکیر بایام اللہ، قوموں کے عروج و زوال کو پیش کرنا: وذکرہم بایام اللہ۔

(ج) تذکیر بما بعد الموت، قیامت اور برزخ کے حالات و واقعات سے عبرت پذیر کرنا۔

سورۂ عصر میں تذکیر بایام اللہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، اور اسی سے استدلال کرکے قوموں کے عروج و زوال میں غور کرنے کی دعوت دی ہے۔

کامیاب لوگ۔

(۳) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، اور
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ — آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو دنیا و آخرت، دونوں جگہ کامیاب ہیں:

(۱) ایمان، یہ امن سے ہے جس کے معنی طمانیت کے ہیں: وامنہم من خوف، اللہ کا نام مومن ہے، اس لیے کہ جب عاجز بندہ پریشان و مضطرب ہو کر اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اسے امن و اطمینان قلب نوازش فرماتا ہے، پس کامیابی کی اولین شرط ایمان باللہ ہے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کے احکام کو تسلیم کرتا ہے، اسی کے آگے دست سوال دراز کرتا ہے، اور اس کے در کو چھوڑ کر دوسروں کی جبہہ سائی نہیں کرتا۔

(۲) عمل صالح، ایمان کا تعلق محض دل سے ہے، بسا اوقات نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود اپنے آپ کو اس کے متعلق دھوکا ہو جاتا ہے، اس لیے شریعت نے اگر ایک طرف زبان سے اقرار پہ زور دیا تو دوسری جانب عمل کی طرف توجہ دلائی تاکہ عمل سے اس کے اقرار کی تصدیق ہو، اس لیے ایمان اور عمل صالح دونوں ملا کر مومن کی تعریف بنتی ہے، اس آیت میں صرف عمل صالح کہا گیا، کسی خاص نیک کام کی تشریح نہ کی، اس لیے کہ انسانی فطرت ہی نیکی اور فرشتگی پہ پیدا کی گئی ہے اور اللہ نے اس کو نیکی اور بدی کا رستہ بتا دیا ہے، پس وہ وہی کام کرے گا جو نظام عالم کے لیے مفید ہو۔

(۳) تواصی بالحق، یہ چیزیں انفرادی زندگی کے لیے ضروری ہیں، مگر فرد کچھ نہیں جب تک تمام قوم کو فلاح و کامرانی نصیب نہ ہو اس لیے محض ایمان باللہ و عمل صالح پر قانع ہو جانا اللہ کی نظر میں کامل شرعی زندگی نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ اس کی زندگی اور موت قوم کے ساتھ وابستہ ہو، زاویہ نشینی اور راہبانہ زندگی شریعت کے نزدیک ناجائز ہے، ہر مسلم کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کو حق و صداقت پر قائم رہنے کی وصیت کرے اس لیے کہ استقامت ہی کامیابی کی اصلی کنجی ہے مگر یہاں پر آکر اس کا قدم رک نہ جائے بلکہ ضروری ہے کہ جس حق پر وہ خود قائم ہے اس کی روشنی تمام عالم میں پھیلا دے اور دنیا کا کوئی گوشہ اسلام کی آواز سے خالی نہ رہے، اس لیے کہ دنیا میں چاروں طرف عقائد میں فساد آچکا ہے، اخلاق برباد ہو گئے ہیں، اور لوگوں نے راہ صدق و اخلاص چھوڑ دی ہے، دنیا میں قوموں کی زندگی اپنے مقاصد و اغراض کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ وابستہ ہے، تمہاری کتاب اعلیٰ ترین، تمہارے عقائد افضل ترین، اور تمہارے اصول و کلیات تعلیم عین فطرت انسانی کے مطابق ہیں، پس قرآن کریم کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کی غایۃ الغایات بنا لو، اور اس کی دعوت و تبلیغ میں سرگرم کوشش کرو۔

(۴) تواصی بالصبر، مگر یاد رہے، دعوت و ارشاد کی راہ میں تکالیف و شدائد ہیں، عوائق و موانع ہیں، آلام و مصائب ہیں، قید خانے کی کوٹھری اور آہنی زنجیریں ہیں، اور سب سے آخر میں جلاوطنی کی سختیاں اور موت کی گھڑیاں ہیں، پس تم ایک دوسرے کو وصیت کرو کہ وہ ان تمام الم ناک حوادث میں صبر و استقامت سے کام لے، راہ حق سے منھ نہ موڑے، اور پہاڑوں کی طرح ثبات قدم و عزم راسخ کا اظہار کرے، اللہ کی رحمتیں بھی انہی لوگوں پر نازل ہوتی ہیں، جو اس کی راہ میں صبر کے دامن کو نہیں چھوڑتے: ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون نحن اولیاؤکم فی الحیوۃ الدنیا و فی الآخرۃ، ولکم فیہا ما تشتہی

انفسکم ولکم فیہا ماتدعون، نزلا من غفور الرحیم (۴۱ : ۳۰ تا ۳۲) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہی، پھر وہ اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے، اور کہیں گے کہ نہ خوف کرو، اور نہ غمناک ہو، اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا خوشی مناؤ، ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے، اور آخرۃ میں بھی تمہارے رفیق ہیں، اور وہاں جس نعمت کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گی، اور جو چیز طلب کروگے تمہارے لیے موجود ہوگی، یہ بخشنے والے رحمان کی طرف سے مہمانی ہی۔

گویا اس سورۃ نے کامیابی وکامرانی کے حسب ذیل اصول بتائے ہیں:

(الف) ایمان باللہ،

(ب) عمل صالح،

(ج) تواصی بالحق،

(د) تواصی بالصبر،

اب اگر تم تاریخ کی ورق گردانی کروگے، اور فلسفۂ عروج وزوال اقوام وملل کا بغور مطالعہ کروگے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ جن قوموں نے ان اصولوں سے اعتصام کیا تھا وہی کامیاب ہوئیں، اور دوسری جماعتوں کو ناکامی کا مونھ دیکھنا پڑا۔

الھمزۃ

(آیات، ۹)

تلخیص مضامین

جو لوگ اخلاق واعمال اور قانون شریعت کی پروا نہ کرکے ہر جائز و ناجائز طریق سے دولت کماتے ہیں، انھیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ یہ مال ہمیشہ ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ جہنم کا ایندھن ہوگا اور اپنے ہمراہ انھیں بھی دوزخ میں لے جائے گا۔



اخلاق اور دولت

باہمی تصادم

دنیا میں عموماً دو قسم کے آدمی نظر آتے ہیں، ایک تو وہ ہی جو دولت کماتا ہی اور اُس کے کسب و حصول میں فضائل اخلاق و محاسن اعمال کو ترک کر دیتا ہی، خدع و فریب اور مکر و زور کی راہ اختیار کرتا ہی، اگر وہ دجل و شیطنت سے کام لیتا ہی تو مال تو اُس کے قبضہ میں آجاتا ہی مگر مذہب اور اخلاق سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہی، مگر اسی کے بالمقابل وہ شریف انسان بھی ہی جو ان حالات میں غربت و افلاس کو ترجیح دیتا ہی، مگر اخلاق اور مذہب کو قربان کرنے کے لئے طیار نہیں ہوتا۔

پہلی طرز کے لوگ کسی طرح بھی جنگلی بھیڑیوں اور درندوں سے کم نہیں، اگرچہ ان کی صورتیں انسانوں کی ہیں، مگر حقیقت میں وہ بہائم اور مجسمہ شیطنت و دجالیت ہیں، تم یورپ کی عیسائی اقوام کو دیکھو وہ دنیا بھر کی فریب کاریاں اور دغا بازیاں کرتے ہیں کہ زمین کا ایک ٹکڑا مل جائے، اور تیل کے چشموں پر کسی دوسرے حق دار کا قبضہ نہ ہو۔

اس سورۃ میں اسی جماعت کے بعض خصائص و امتیازات بتائے جاتے ہیں، اور ان کے انجام پر روشنی ڈالی جاتی ہی۔

گمان باطل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۱) وَيْلٌ لِّكُلِّ ہر طعن پیشہ اشارتیں کرنے والے چغل خور کی خرابی ہی

هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (۲) اِلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ (۳) یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ

جو مال جمع کرتا اور اُس کو گن گن کر رکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اُس کا مال اُس کی ہمیشہ کی زندگی کا موجب ہوگا۔

ہمزہ لیا گیا ہے ہمز سے لغت میں توڑنا کہتے ہیں اس جگہ عیب چینی مراد ہے کیونکہ اس کا مرتکب لوگوں کی عزت برباد کرتا ہے، لمزہ ماخوذ ہے لمز سے طعن کرنے کو کہتے ہیں عدد کے معنی شمار کرنے اور گننے کے ہیں اخلدہ اور خلدہ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی وہ اس کو ہمیشہ رکھے گا۔

جو لوگ حصول دولت کو اپنی زندگی کی انتہائی غرض بنا لیتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ تمام اخلاق کریمانہ سے بعد و ہجر اختیار کر لیتے ہیں اور ان ارباب صدق و اخلاص کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو دولت کی خاطر اپنے ایمان کو فروخت نہیں کرتے اُن پر آوازے کستے ہیں ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور ہمیشہ اُن کے عیوب کی تلاش میں رہتے ہیں اُن کی آنکھوں میں عزت تو صرف اس شخص کی ہے جو مالدار ہو یہ بدبخت دولت کی محبت میں سرشار ہیں اس کو گن گن کر رکھتے ہیں اور اس گمان باطل میں ہیں کہ دولت کی فراوانی اور مال کی کثرت ان سے فرشتۂ اجل کو دور کر دے گی۔

مگر ان سے کوئی جا کر کہہ دے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو یہ ہمیشگی کے سامان نہیں بلکہ تباہی اور بربادی کی تیاریاں ہیں اس خدع و فریب کا نتیجہ ہلاکت ہی ہلاکت ہے، آج یورپ کی سفید رنگ عیسائی اقوام کی یہی کیفیت ہے، وہ مسلمانوں کو فنا کرنے کی تجویزیں میں ہیں اور آئے دن انکے نقائص و ذمائم اخبارات و تصانیف کے ذریعے دنیا کے اس کنارے سے اُس کنارے تک پہنچا دیتے ہیں انھیں چاہیے کہ اپنی چشم بصیرت وا کریں قرآن کے درس و مطالعہ سے بہرہ اندوز ہوں اور کوئی حکیم اجتماعی انھیں قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ بتائے۔

نتیجہ

(۴) كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (۵) وَمَآ أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ (۶) نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ (۷) الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ (۸) إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ (۹) فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ

ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا، اور تم کیا سمجھے کہ حطمہ کیا ہے، وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر جا لپٹے گی اور وہ اُس میں بند کر دیئے جائینگے یعنی آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں۔

نبذ کے معنی پھینکنے اور ڈال دینے کے ہیں، حطمہ دوزخ کا نام ہے اور اس کے لغوی معنی کسی چیز کے ٹکڑا ٹکڑا کر دینے کے ہیں، دوزخ بھی ہر اُس چیز کو چورا چورا کر دے گی جو اُس میں ڈالی جائے گی اس لیئے دوزخ کو بھی حطمہ کہتے ہیں، تطلع ماخوذ ہے طلوع سے اس کے معنی بلند ہونے کے ہیں، موصد یعنی مطبقہ، بند کرنا، عمد جمع ہے عمود کی اس کے معنی ستون ہیں۔

گذشتہ آیات میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ سب دوزخ کا ایندھن بنیں گے، اور قلب چونکہ تمام اخلاق و کمالات، فضائل و رذائل، نیات و مقاصد اور عقائد و یقینیات کا مرکز ہے یہی وجدان کا اصلی موطن ہے، اور یہی شعور کی جگہ، اس لیے جہنم کی شعلہ مارنے والی آگ کا اولین حملہ اسی قلب پر ہوگا، اور اس کی شدت التہاب و حرارت کی یہ حالت ہے کہ وہ لمبے لمبے ستونوں میں بند ہے، جو ہر طرف سے مسدود ہونے کی وجہ سے اور زیادہ تیز ہو گئی ہے۔

الفیل

(آیات ۵)

تلخیص مضامین

اس سورۃ میں کمال ایجاز واختصار کے ساتھ ابرہہ والی یمن کے اس حملہ اور نتیجہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اس نے بیت اللہ کے گرانے کی خاطر اس اول بیت وضع للناس پر کیا تھا، اور جس حملہ کی وجہ سے اس سال کا نام عام الفیل ہو گیا تھا۔

شعائر الٰہیہ

واقعہ کی تفصیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ (۲) اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَہُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ (۳) وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ (۴) تَرۡمِیۡہِمۡ بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ (۵) فَجَعَلَہُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا، کیا ان کا داؤں غلط نہیں کیا' (کیا)، اور ان پر جھلڑ کے جھلڑ جانور بھیجے' جو ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے' تو ان کو ایسا کر دیا جیسا کھایا ہوا بھس۔

ابرہہ بن الاشرم حبشی سردار مذہب کے اعتبار سے عیسائی تھا' یمن کے عیسائیوں نے اس کی سرکردگی میں بیت اللہ الجلیل کے توڑنے کی خاطر مکہ پر فوج کشی کی، خانہ کعبہ کے توڑ دینے سے اس کی غرض یہ تھی کہ اس کے ٹوٹ جانے سے اس کا کینسہ عرب کا مرجع بن جائے گا، اور اہل عرب میں عیسوی مذہب کی بآسانی نشر و اشاعت ہو سکے گی۔

قریش میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس کے لشکر کا مقابلہ کرتے' اس لیے شہر خالی کر کے باہر چلے گئے، جانے سے قبل سردار قریش عبدالمطلب بیت اللہ میں گئے' اور زنجیر کعبہ کو پکڑ کر یوں گویا ہوئے:

لاھم ان المرء یمنع حلہ فامنع حلالک!

ہم اگرچہ عاجز ہونے کی وجہ سے شہر خالی کر کے جا رہے ہیں' مگر کوئی غم کی بات نہیں ہر شخص

اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے خداوندا! تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر اور اس کو دشمنوں کی دست برد سے بچالے

وانصر علی آل الصلیب وعابدیہ الیوم آلک!

صلیب کے پوجنے والے عیسائیوں کے مقابلہ میں تو اپنی آل قریش کی نصرت و اعانت فرما۔

لا یغلبن صلیبھم۔ ومحالھم عدوا محالک!

اے خدائے کعبہ! دیکھ، آج کے دن صلیب پرست تیرے گھر پر قابض نہ ہو جائیں!

ان کنت تارکھم وکعبتنا فامر ما بدالک!

اگر تیرا یہی منشا ہے کہ یہ عیسائی ہمارے کعبہ پر قبضہ کرلیں تو پھر جو تیرا جی چاہے ارشاد فرما۔

جب تمام قریش شہر چھوڑ کر باہر خیمہ زن ہوئے تو عبدالمطلب کو معلوم ہوا کہ ان کے کچھ اونٹ دشمن کے لشکر میں پہنچ گئے ہیں، وہ اس حبشی سردار کے پاس گئے اور اس سے اونٹوں کا مطالبہ کیا، ابرہہ نے ان کی آمد پر بہت زیادہ ادب و احترام کا لحاظ کیا تھا، مگر اس سوال پر کہنے لگا کہ میں تو آپ کو صاحب دانش و بینش خیال کرتا تھا، اگر آپ مجھ سے یہ کہتے کہ میں خانۂ کعبہ توڑے بغیر چلا جاؤں تو کیا اچھا ہوتا، انھوں نے جواب دیا کہ میں صرف ان اونٹوں کا مالک ہوں اس لئے مجھے ان کی فکر ہے، خانہ کعبہ کا جو مالک ہے اس کی فکر وہ آپ کرلے گا، بہرحال مکۂ مبارکہ پر ابرہہ نے حملہ بول دیا۔

قانون تعذیب امم

قرآن کریم میں درس و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک قوم بغی و عدوان کے انتہائی منازل طے کرلیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس امت کو برباد کر دیتا ہے، مگر اس قانون تعذیب امم کو دو تاریخی دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) ایک دور ابتدا سے شروع ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آ کر ختم ہو جاتا ہے اس وقت

تک انبیاء کرام کے اصحاب و حوارین کی تعداد بہت کم ہوتی ہے، اس لیے مخالفین کے مقابلہ میں انھیں جانے کا حکم نہیں دیا جاتا، بلکہ کائنات ارضی و سماوی کو ان کی ہلاکت و بربادی پر متعین کیا جاتا ہے، کبھی طوفان آتا ہے، کسی وقت آندھی آتی ہے، اور کبھی زلزلوں سے ایک مجرم جماعت کو ہلاک کیا جاتا ہے، چنانچہ اس سلسلہ کی آخری کڑی فرعون اور اس کی قوم ہے۔

(ب) اب رسولوں کے اتباع و مقلدین کی تعداد کافی ہونے لگی، اس لیے قانون یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے دشمنوں کو ذلیل کر دیا جائے۔ لیکن اس تقسیم کا یہ مطلب نہیں کہ اب خدا ہماری اس تقسیم کا پابند رہے گا، بلکہ وہ ذو العرش المجید اور فعال لما یرید ہے، جس طریق پر چاہے ایک قوم کو برباد کر سکتا ہے۔

لارڈ کچنر اپنے آپ کو فرعون مصر کہا کرتا تھا، اس لیے وہ ٹھیک اپنے پیش رو کی طرح غرق ہوا۔ یمن کے عیسائی آگے بڑھے کہ بیت اللہ کو توڑیں، قریش عاجز و درماندہ تھے، دنیا میں اور کوئی طاقت نہ تھی جو اس اول بیت وضع للناس کی حفظ و نگہداشت میں اپنا خون بہا دیتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قانون تعذیب امم کی شق اول کے مطابق چڑیوں کو بھیجا، ابرہہ کو اپنے عظیم الجثہ ہاتھیوں پر فخر و ناز تھا، اس لیے خدا نے بھی ایک حقیر ترین پرندے کو اس متکبر لشکر کے برباد کرنے کے واسطے چن لیا، وہ چڑیاں اصحاب فیل پر کنکریاں گراتی تھیں، اور جس پر کنکری گرتی تھی وہ چیچک کے مرض میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ عرب میں سب سے پہلے چیچک کا ظہور اسی واقعہ سے ہوا، ٹھیک اسی زمانہ میں علاقہ سویز اور طور سینا میں چیچک کا مرض پھیلا ہوا تھا، ممکن ہے کوئی بہت بڑی آندھی چڑیوں کو اس علاقہ سے اڑا لے گئی ہو جو چیچک کے جراثیم کنکریوں میں لے گئی ہوں، تاکہ اللہ کے حکم سے انھیں تباہ و برباد کر دیں۔

یہ ایک عذاب تھا جو ان بدبختوں پر مسلط کردیا گیا تھا، اُنھیں یہ بتانا تھا کہ ہم کائنات ارضی وسماوی کی حقیر ترین چیز کو بھی ہلاکت و بربادی کا سبب بنا سکتے ہیں، یہی پانی ہے جو انسان کی زندگی کا باعث ہوتا ہے: وجعلنا من الماء کل شیء حی، مگر اسی سے ہم نے دشمنان نوح کو برباد کردیا، یہی ہوا ہے جس نے قوم عاد کو نیست و نابود کردیا، پس خدا کی قدرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ جس سے چاہے تباہی کا کام لے لے: وما یعلم جنود ربک الا ہو۔

غرض اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام حملہ آور عیسائی برباد ہو گئے انھیں اپنے مقاصد میں ناکامی اور خسران نصیب ہوا، اور ان کا خود گرجا بھی جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

تشریح الفاظ

کید کی پوری تفصیل سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے، اس کی طرف رجوع کیجیے، یہاں بُری تدبیر مراد ہے، تضلیل کے معنی ضائع کرنے اور تدبیر میں ناکام رہنے کے ہیں، ابابیل کے معنی گروہ، جماعتیں اور فرقے ہیں، اس کا اطلاق جانوروں اور پرندوں پر ہوتا ہے، سجیل، یہ لفظ فارسی سے لیا گیا ہے، جسے سنگ گل یعنی کھنگر کہتے ہیں، عصف، برگ کشت، ماکول جس کو جانوروں نے کھا لیا ہو، اور باقی کو ردی سمجھ کر زمین پر پھینک دیا، یا پاؤں تلے روند ڈالا۔

ضروری تشریح

اس قدر تشریح کے بعد زیادہ تفسیر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اصحاب فیل کا حملہ مشہور ترین قصہ ہے جس کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ عرب کے نزدیک تو یہ قصہ اس درجہ اہمیت رکھتا تھا کہ انھوں نے اپنا سال ہی اسی سے شروع کیا، اور اس کا نام عام الفیل رکھا، اور سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ اس حادثہ کے دو ایک ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی جیسا کہ تمام معتبر روایت سے ثابت ہے۔

نتائج وعبر

یہ ایک واقعہ تھا جو ہوگیا، مگر قرآن کوئی تاریخی کتاب نہیں، جو اس قصہ کی حکایت کرتی بلکہ اس کے بیان سے غرض عبرت وبصیرت ہے، اور اس سے حسب ذیل نتائج وعبر کا استخراج واستنباط ہوتا ہے:

(۱) دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا، ان کو اپنی یادگار قرار دیتا، اور ان کی حفظ ونگہداشت اپنے اوپر لیتا ہے، وہ شعائر الٰہیہ یہ ہیں:

(الف) قرآن، اس کی نسبت فرمایا: انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحٰفظون (۱۵: ۹) بیشک یہ کتاب نصیحت ہمیں نے اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

(ب) محمدؐ، آپ اللہ کے رسول ہیں، قرآن میں آتا ہے: واللہ یعصمک من الناس (۵: ۶۷) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔

(ج) نماز، اس کو کفر واسلام میں مابہ الامتیاز چیز قرار دیا گیا، قرآن نے اکثر مقامات میں اس کو ایمان کے ساتھ ذکر کرکے بتا دیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں، اس کا پڑھنا ہر مسلمان پر لازم کردیا، اور آج بلاشبہ جس طریق پر نماز پڑھی جاتی ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادا کیا کرتے تھے، یہی اس کی حفظ ونگہداشت ہے۔

(د) بیت اللہ، اس کا نام ہی اپنی نسبت کو ظاہر کررہا ہے، ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے آج تک اس کا حج ہوتا ہے، اس کی حفاظت کی یہ صورت کردی: ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم (۲۲: ۲۵) اور جو اس میں شرارت سے کجروی وکفر کرنا چاہئے اس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

سورۃ الفیل نے اس حقیقت پر مہر لگادی کہ یہ اللہ کا گھر ہے، اور وہی اس کا نگران کار ہے،

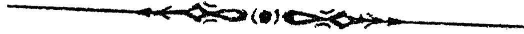
قریش اگرنا قابل تھے تو خدا نے اُس کی حفاظت کے دوسرے سامان پیدا کردیے اور وہ اب بھی ایسا کرسکتا ہے، مگر فرزندان اسلام کو چاہیئے کہ اس سعادت کبریٰ کو وہ خود حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اُس وقت تک دم نہ لیں جب تک ارض حجاز کو تمام غیر مسلم اقوام کے اثر و نفوذ اور بالا دستی سے پاک وصاف نہ کرلیں اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو وہ اُس زعم باطل میں نہ رہیں کہ ہمارے انحراف و اجتناب سے کعبہ کی نگرانی بھی نہ ہوگی، یاد رکھو وہ خدائے قہار تمہاری اعانت سے بالکل بے نیاز ہے بلکہ تم ہی اس کے محتاج ہو، وہ اس کی حفظ وصیانت کے لیے دوسری قوتوں سے بھی کام لے سکتا ہے: ومن یعظم حرمات اللّٰہ فھو خیر لہ عند ربہ (۲۲: ۳۰) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے، تو یہ پروردگار کے نزدیک اُس کے حق میں بہتر ہے، اس کے بعد فرمایا: ومن یعظم شعائر اللّٰہ فانہا من تقوی القلوب (۲۲: ۳۲) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے، تو یہ فعل ان کی پرہیزگاری میں سے ہے۔

عیسائی اور مسلمان

(۲) ابرہہ نے ۵۷۰ء میں مکہ پر فوج کشی کی، اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی، واقعہ فیل دراصل آپ کے لیے پیش خیمہ تھا، باوجودیکہ قریش مشرک تھے اور حملہ آور عیسائی مگر پھر بھی خدا نے ان صلیب پرستوں کو ذلیل کیا، یہ ایک ایسی فتح مبین تھی، جس میں انسانی ہاتھ کو مطلق دخل نہ تھا، غرض یہ تھی کہ خانہ کعبہ اور مکہ کی بزرگی مسلم ہو جائے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی بابرکت ولادت کا مقصد یہ تھا کہ آپ ایک جدید امت مسلمہ کی ہنیاد ڈالیں، جو عالمگیر برادری قائم کرے، تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لے آئے اور بیت اللّٰہ اس کی تمام سعی وکوشش کا مرکز ہو، لیکن عین آپ کے ظہور قدسی سے چند ماہ قبل ایک عیسائی بادشاہ اس بیت اللّٰہ الجلیل کو توڑنے کی فکر کرتا ہے، اس توافق حالات سے لطیف طور پر یہ نتیجہ اخذ

کیا جا سکتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ دنیا میں اس اول بیت وضع للناس کے شدید ترین دشمن یہی عیسائی ہوں گے، وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہیں گے کہ بیت اللہ کو تباہ و برباد کر دیں، ارض حجاز پر قبضہ کر لیں، اس مرکز کو ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کو عیسائی بنا لیں ورنہ ان کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیں۔

تاریخ اپنے پورے تسلسل کے ساتھ ہمارے اس نتیجہ کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے، اور آج کل کے واقعات تو کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں، حسین کا جو انجام ہوا وہ سب پر ظاہر ہے۔



القریش

چار آیات

تمہید

قریش کو تجارت کا شوق تھا، اور وہ سردی اور گرمی میں یمن اور شام کی طرف تجارت کے قافلے لے کر جاتے اور مالا مال ہو کر واپس لوٹتے، انھیں دشمن کا خوف نہ تھا، اور انکی ضروریات زندگی بھی سب کی سب پوری ہو جاتیں، اس لیے انھیں چاہیے کہ اسی ایک خدا کی عبادت کریں جس نے ان پر یہ نعمتیں نازل کیں، اور اصنام و طواغیت کے آگے سربسجود نہ ہوں۔

صوفیاے کرام وعلماے عظام

شوق تجارت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ (۲) اِلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ (۳) فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ (۴) الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ۔

قریش کے مانوس کرنے کے سبب یعنی ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب لوگوں کو چاہیے کہ اس نعمت کے شکر میں اس گھر کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا، اور خوف سے امن بخشا۔

الف، الاف اور ایلاف، تینوں کے معنی ہیں الفت دلانا، دوسرا ایلاف پہلے سے بدل واقع ہوا ہے، رحلۃ کے معنی کوچ کرنے کے ہیں اور یہ ارتحال کا اسم ہے۔

قریش اس قبیلہ کا نام ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے یہ لوگ بیت اللہ کے مجاور اور خادم تھے، اس جاروب کشی کا یہ اثر تھا کہ تمام قبائل عرب اور دور دراز کے لوگ ان کی عزت و تکریم کرتے ملک میں سب طرف لوٹ مار رہتی مگر بیت اللہ کے ادب و احترام کی وجہ سے مکہ مبارکہ میں برابر امن و امان رہتا، یہ لوگ سردی میں یمن کی طرف اور گرمی میں شام کی جانب تجارت کی غرض سے سفر کرتے، اللہ کے پاک گھر کی ہمسائیگی کا یہ نتیجہ تھا کہ کوئی ان کا مزاحم نہ ہوتا، بلکہ سب ان کا اکرام و احترام کرتے، ان کی خدمت میں نذر و ہدایا پیش کرتے اور ان کا

اپنی تجارت میں شادکام و بامراد ہو کر اپنے گھروں کو واپس لوٹتے۔

اس سورت میں ان نعمتوں کو یاد دلا کر قریش سے یہ کہا گیا کہ تمہاری عزت لوگوں کے دلوں میں صرف اس لیے ہے کہ تم بیت اللہ کے مجاور اور خادم ہو، ورنہ سرزمین عرب میں اور بھی قبائل ہیں مگر انھیں کوئی پوچھتا بھی نہیں پس جب تمہاری یہ عزت و تکریم محض بیت اللہ کے خدمت گذار ہونے کی وجہ سے ہے، اور اس کی ہمسائیگی کی بدولت کسی کو تم پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تو شرط انصاف یہی ہے کہ جس گھر کی بدولت تمہیں یہ سب کچھ حاصل ہے، اسی کے مالک کی غلامی کرو، اور اسی ایک اللہ کے آگے خمیدہ گردن ہو جاؤ۔

بصائر و حکم

اس سورۂ مبارکہ میں عبرتوں اور بصیرتوں کے مخفی خزانے ہیں، اگر دیدۂ عبرت سے اس کا درس و مطالعہ کیا جائے تو اس سے حسب ذیل حکمتوں کا استنباط و استخراج ہوتا ہے:

(۱) دنیائے اسلام آج بھی اہل عرب کی وہی عزت و تکریم کرتی ہے جو اہل عرب قریش کی کیا کرتے تھے، عربوں کے اکرام و احترام کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کے گھر کے مجاور، رسول اللہ کی مسجد کے جاروب کش، اور اس سرزمین کے رہنے والے ہیں، جہاں سرور عالم فداہ ابی و امی جلوہ فرما ہوئے، پس جب ان کے ادب و احترام کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں تو ان کا یہ دینی فرض ہے کہ وہ سرزمین عرب کو غیر مسلم اقوام کے ناپاک اثرات سے بالکل صاف کر دیں، اس بقعہ مبارکہ کو صرف فرزندان اسلام ہی کے لیے مخصوص کر دیں، بیت اللہ کو اصلی معنی میں حرماً امناً بنا دیں، کسی غیر مسلم طاقت سے نہ سراً و علناً کوئی وظیفہ طلب کریں، نہ کسی یورپین حکومت کی بالا دستی قبول کریں، اور نہ غیر اللہ سے خوف زدہ ہوں اس لیے کہ جس اللہ نے قریش کو اطعمہم من جوع و اٰمنہم من خوف سے سرفراز کیا تھا، وہ اللہ آج بھی زندہ ہے،

غیر مسلم اقوام کے خوف سے بھی ان کو محفوظ و مصئون کر دے گا، اور اسی گ
دولت ان کے پاؤں پر نثار کر دے گا: وکان وعدا مفعولا۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دونوں چیزوں کی بشا
سے محفوظ رکھے گا اور ان کو معیشت کی فکر سے بے نیاز کر دے گا
کے گھر کی حفظ و صیانت میں لگا دیں گے، خدا کا وعدہ سچا ہے اس پر اعـ
من اللہ قیلا، اللہ سے بڑھ کر سچ بولنے والا، اور اپنی بات کا پکا کو ا
(۲) دنیائے اسلام میں ہر جگہ علمائے کرام و صوفیائے عظا
کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور تمام مسلمان بلا استثناء ان کی عزت و
ادب و اکرام کا اگر کوئی سبب ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ا
ہیں اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں اور اسی کی طرف سب
ان میں سے اکثر اپنے فرائض کو فراموش کر چکے ہیں اور راحت و آ
مگر کتاب و سنت کے ساتھ انہیں جو نسبت ظاہری حاصل ہے، تا
کو اب بھی برابر ملحوظ رکھتی ہے۔

پس جب ان دونوں گروہوں کی عزت صرف اسی وجہ سے
کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ اللہ کی غلامی اور عبودیت کا جوا اپنی گ
طوق لعنت اس میں ڈال لیں اپنی ابلیسانہ کارروائیوں سے غیر
اسلامی پر قبضہ کرنے میں مدد کریں اور جب ہلال کی جگہ صلیب لہ
حاضر ہو کر اپنے عیسائی حکمرانوں کی خدمت میں تبریک و تہنیت پیش
اب تک کرتے رہے ہیں الا ماشاء اللہ وقلیل ماہم ۔

الماعون

ساتِ آیات

تمہید

اس سورت میں قوموں کی تباہی وبربادی کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب پر بحث کی گئی ہے اور وہ بخل وامساک ہے، قول اور عمل میں باہمی تطابق ضروری ہے اور آخر میں اُن لوگوں کو دھمکی دی ہے جو باوجود نماز کے پابند ہونے کے ذرا ذرا سی بات میں بخل سے کام لیتے ہیں۔



مالی قربانی

زبانی دعویٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ	بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہی، یہ
یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (۲) فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ	وہی بدبخت ہی جو یتیم کو دھکے دیتا ہی، اور فقیر کو کھانا کھلانے
الۡیَتِیۡمَ (۳) وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ	کے لیے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔

قوموں کی تباہی و بربادی کے اصول و کلیات تو بہت ہیں، مگر دو چیزیں ایسی ہیں جو ان سب کی اصل و اساس ہیں، جب کسی قوم کے افراد اپنی ضرورتوں کو مقدم کر دیں، اپنے ذاتی نفع و ضرر کو ترجیح دیں، اور قوم کی پروا نہ کریں تو اس جماعت کا زندہ رہنا غیر ممکن ہو جاتا ہی، کوئی جماعت ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے پاس روپیہ نہ ہو، اور جب ارکان ملت ہی بخل و امساک پر کمر باندھ لیں تو دوسرا کون ان کی امداد کرے گا۔

اقوام و ملل کی تباہی اسی مال کی محبت سے شروع ہوتی ہی، ایک شخص یہ اقرار کرتا ہے کہ جزائے اعمال یقینی ہے، میری ہر سعی و کوشش کا نتیجہ قومی نشو و ارتقا ہی، اور اس کا دائمی ثمرہ مرنے کے بعد ملے گا، مگر اس کے اعمال اس دعوی کے بخط مستقیم مخالف ہیں، وہ یہ جانتا ہی کہ قوموں کی حیات مساکین و یتامی کی تربیت کے ساتھ وابستہ ہی، اگر ان افراد کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ کیا جائیگا تو یہ قوم کے لیے بار دوش ثابت ہوں گے، اور غیر مذاہب کے لوگ انھیں اپنی طرف لے جائیں گے،

مگر باوجود اس کے اس کی حالت یہ ہے کہ نہ صرف ان کی حفظ و نگہداشت سے انکار کرتا ہے، بلکہ اس کے مصالح خصوصی اور ذاتی اغراض اس پر اس درجہ غالب آگئے ہیں کہ دوسروں کو بھی ان کی امداد و اعانت پر نہیں اُبھار سکتا۔

جس شخص کے یہ اعمال ہوں تو کیا کوئی عقل مند انسان بھی اس کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ جزائے اعمال کا اقرار کرتا ہے، اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ یہ بدبخت اپنے عمل سوء سے اپنے دعوی کی آپ تکذیب کر رہا ہے، پھر جس قوم میں اس قسم کے افراد کی کثرۃ ہو اس کے زندہ رہنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

حقیقت نماز سے غفلت

(۴) فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (۵) اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (۶) اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ (۷) وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔

تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے، جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں عاریت نہیں دیتے۔

بھلا ان لوگوں کی نمازیں کس کام کی، نماز کی غرض تو یہ تھی کہ انسان ہر قسم کی بداخلاقی اور خلاف مروت و دیانت باتوں سے پرہیز کرے اس سے بڑھ کر اور کیا بداخلاقی ہو سکتی ہے کہ ہمارا ایک بھائی بھوک کے مارے تڑپ رہا ہے، مگر ہم ہیں کہ ٹس سے مس بھی نہیں ہوتے، اس کو بھوکا مرنے دیتے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی سے اس کو کچھ دلوا دیں، نماز میں سربسجود ہونے کا مقصد یہ تھا کہ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی تک مٹانے کو طیار ہوں اگر یہ جذبہ صادقہ ہو تو بندگان خدا کی خدمت کو اپنا فخر خیال کرے، لیکن جب مخلوق خدا کی دل آزاری کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ نماز ریاکاری کی پردہ رہا ہے۔

ماعون

ایک یتیم اور مسکین کی امداد تو بڑی بات ہے، اس میں تو بخل کا مرض اتنا ترقی کر گیا ہے کہ معمولی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی دوسرے کو عاریۃً نہیں دے سکتا۔

ماعون کے متعلق احادیث میں مختلف چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان روایات کی بنا پر مفسرین کرام کے اقوال میں بھی بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں اس لیے کہ لفظ عام ہے اور تمام چیزیں اس کے دائرے میں آجاتی ہیں، غرض ان سب کی یہ ہے کہ جو شخص ان حقیر وادنی چیزوں میں بھی ایثار و فدویت سے کام نہیں لے سکتا اور اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس سے کسی بڑی قربانی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

قوموں کی تباہی اسی مرض بخل ہی سے شروع ہوتی ہے، پس مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس خبیث مرض سے بچنے کی کوشش کریں، اور ملک و ملت اسلام کے نام پر اپنی دولت لٹانے کو تیار ہو جائیں کہ اس کے بغیر نہ تو کلمۃ اللہ بلند و برتر ہو سکتا ہے، اور نہ بلاد اسلام کو مکمل آزادی مل سکتی ہے۔



الکوثر

تمہید

تین آیات

ان تین آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت قرآن ہی، اس کی نشر و اشاعت کرو، اور جانی قربانی کے لیے تیار رہو، اس کے بعد تمہارے دشمنوں کا تباہ و برباد ہو جانا قطعی اور یقینی ہے۔



حیاتِ ملّی

کوثر کا مطلب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱) اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ ہم نے تم کو کوثر عطا فرمائی ہے۔

لفظ کوثر دراصل کثرت سے فوعل کے وزن پر صیغہ مبالغہ ہے، اس کے معنی میں مفسرین نے شدید اختلاف کیا ہے، اس کی تفسیر میں سولہ اقوال بیان کیے گئے ہیں، اس کے اصلی معنی تو خیر کثیر ہی کے ہیں، مگر اختلاف اس میں ہے کہ اس کا صحیح اطلاق کس پر ہوتا ہے، اگر بنظر غور دیکھا جائے تو ہر قول اپنے مقصود کے اعتبار سے ٹھیک ہے، ہم ان میں سے صرف ایک کو منتخب کرتے ہیں، اور وہ قرآن کریم ہے۔

سورۂ بقرہ میں آتا ہے: یوتی الحکمۃ من یشاء ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا (۲: ۲۶۹) وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی آیت میں خیر کثیر کا اطلاق حکمت اور دانائی کی باتوں پر کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ قرآن سے بڑھ کر دنیا کے لیے اور کون سی دانائی ہو سکتی ہے، وانہ لکتب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (۴۱: ۴۱ و ۴۲) اور یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے، اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے، اور دانا اور خوبیوں والے خدا کی اُتاری ہوئی ہے، اس آیت کی

بنا پر ہمارے نزدیک سب سے زیادہ قابل ترجیح قول یہی ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔

مگر ساتھ ہی اس کے ہم اس حدیث کو بھی تسلیم کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حوض کوثر دیا گیا ہے، ہمارا خیال یہ ہے کہ دونوں اقوال کا مصداق ایک ہی ہے، اور وہ قرآن ہے۔

کتاب و سنت کے درس و مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا موطن بھی ہے جہاں معانی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اسے حکماء کی اصطلاح میں عالم مثال کہتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ اور خیر کثیر میں اس کی تفصیل کی ہے، سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے بھی اس کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے ومن شاء التفصیل فلیرجع ثمہ۔

عالم مثال کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن ایک کتاب ہے جو دنیا کو علم بخشتی ہے، اسی کتاب عزیز کی مثالی صورت وہ حوض کوثر ہے جس کی صفات و مختصات حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔

شکر نعمت

(۲) فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ تو اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو، اور قربانی کیا کرو۔

اس عظیم و جلیل نعمت اس خیر کثیر، اور اس بصائر للناس قرآن کریم کا شکریہ ہے کہ تم اللہ کے لیے نماز پڑھو، اس نماز میں قرآن پر غور کرو، اس کتاب عزیز کی نشر و اشاعت کی تدابیر سوچو اور تمہاری سعی و کوشش یہ ہو کہ اس کی آواز دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جائے: بلغ ما انزل الیک، جو قرآن تمہاری طرف اُتارا گیا ہے اس کا شکر یہی ہے کہ اسے دوسروں کے پاس پہنچا دو۔

دوسرے اللہ ہی کے لیے قربانی کرو، تا آنکہ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین کی حقیقت تم پر طاری ہو جائے، تم ابراہیم کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھو، خدائے قدوس کے قانون کو بلند کرنے کی خاطر وہ اپنی جان، اپنا وطن، اپنی قوم، اور اپنے بیٹے کو قربان کر چکے تو انھیں دنیا وآخرت کی امامت وسرفرازی نوازش کی گئی: واذا ابتلی ابراہیم ربہ بکلمات فاتمہن، قال انی جاعلک للناس اماما، اسی ایثار وفدویت کی بدولت انھیں دین اور دنیا کی برگزیدگی بخشی گئی: ولقد اصطفینہ فی الدنیا وانہ فی الاخرۃ لمن الصلحین۔

قربانی کا مقصد محض جانور ذبح کرنا نہیں، بلکہ غرض یہ ہے کہ ذبح کرتے کرتے ہم خود اللہ کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہو جائیں اور کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی اس راہ میں حائل نہ ہو سکے، انسان کی سب سے بڑی سعادت ونیک بختی یہ ہے کہ وہ کلمۃ اللہ کی بلندی وبرتری کے لیے سب کچھ قربان کر دے اسلام میں قومیت اور وطنیت کوئی چیز نہیں، بلکہ جو کچھ کریں اللہ کے قانون کی نشر واشاعت اور عالمگیر برادری کے قیام کے لیے کریں۔

اس کا نتیجہ

(۳) اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ـ جو تمہارا براچاہے اسی کا کوئی نام لیوا نہ رہے گا۔

شانی کے معنی مبغوض کے ہیں اور شنان بغض کو کہتے ہیں، ابتر اس جانور کو کہتے ہیں، جس کی دم کٹی ہوئی ہو، اس شخص کو بھی ابتر کہا جاتا ہے جس کے اولاد نہ ہو، اور اس کا نام لینے والا نہ ہو، عموماً اولاد ہی سے باپ دادا کا نام باقی رہتا ہے، پس ابتر وہ شخص ہے جس کا ذکر خیر باقی نہ رہے اس آیت میں یہی مراد ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ جب کبھی عاص بن وائل کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا کہ اس کا تو نام ہی نہ لو، اس کے اولاد تک نہیں جو اس کا نام زندہ رکھے،

اس کے مرتے ہی تمام جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل کی۔

اس سورت میں رسول اللہ کو یہ بشارت دی گئی کہ آپ کفار کی یہ باتیں سنکر پریشان خاطر نہ ہوں آپ کے دشمن مٹ جائیں گے، اور ان کا نام ونشان باقی نہ رہے گا، اللہ نے آپ کو ایسی عظیم الشان خیر وبرکت دی ہے جس کا سلسلہ ہی منقطع نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ بڑھتا ہی جائے گا، چنانچہ یہ وعدہ پورا ہو کر رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک دنیا کے ہر گوشہ اور کونہ میں پہنچا ہوا ہے، مگر کفار و معاندین اس طرح بے نام ونشان ہیں کہ تاریخ کے اوراق بھی ان کے حالات و واقعات سے خالی ہیں۔

یہ نہ خیال کیا جائے کہ اس سورت میں جو وعدہ دیا گیا ہے، وہ صرف رسول اللہ ہی کی ذات کے لیے مخصوص ہے، بلکہ تمام امت مسلمہ بھی اس میں شریک ہے، اور خداوند قدوس آج بھی پکار پکار کر فرزندان اسلام کو یہ مسرت اندوز بشارت دے رہا ہے کہ اگرچہ دنیائے عیسائیت تمہارا نام ونشان مٹانے پر متحد ہو چکی ہے، اور ہر طرف سے تکلیفوں اور مصیبتوں کی تاریکی نے تمہیں گھیر لیا ہے، مگر یاد رکھو اگر تم فصل لربک وانحر کی حقیقت اپنے اوپر طاری کر لو، قرآن کریم کی نشر واشاعت کے لیے تمام دنیا کو چھان مارو، اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ، ایک ایک مسلمان مجسمۂ ایثار و فدویت ہو، اور جب کبھی اسلام کو ضرورت ہو تو وہ اپنا آخری قطرۂ خون تک اس کے حفظ و صیانت میں بہانے کو تیار ہو، تو پھر دنیا تمہاری ہے، تمہارا ہی بول بالا ہوگا، تمہارا ہی ذکر خیر ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا، اور تمہارے تمام دشمن نیست و نابود ہو جائیں گے

وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

الکافرون

(چھ آیات)

تمہید

اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا ہی کہ وہ کفار سے انقطاع تعلقات و روابط کا اعلان ان الفاظ میں کر دیں کہ نہ تو میں اس وقت کفار کے معبودان باطل کی پرستش کر سکتا ہوں اور نہ آیندہ وہ مجھ سے اس قسم کی توقع رکھیں بلکہ اب ان سے ہر قسم کا رشتہ توڑ لیا گیا ہی۔



انقطاع تعلقات

ناممکن

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ (۲) لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۳) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔

اے پیغمبر! منکران اسلام سے کہہ دو کہ اے کافرو! جن بتوں کو تم پوجتے ہو اُن کو میں نہیں پوجتا، اور جس خدا کی میں عبادت کرتا ہوں اُس کی تم عبادت نہیں کرتے

سورۂ کوثر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو بشارت دی گئی تھی کہ اگر انہوں نے اشاعت قرآن اور قربانی کو اپنا نصب العین بنا لیا تو ہر جگہ وہی کامیاب رہیں گے اور اُن کے مخالفین کا نام و نشان مٹ جائے گا، اب اس سورۃ میں تمام معاندین اسلام پر یہ واضح کر دیا جاتا ہے کہ کفر و اسلام میں اتحاد ناممکن ہے، یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک سال میں تمہارے معبودانِ باطل کی پرستش کروں اور دوسرے سال تم میرے خدا کو پوجو۔

جو لوگ عرب کے حالات سے واقف ہیں وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ ہر قبیلہ اپنا جداگانہ بت رکھتا تھا، جب کبھی دو قبیلوں میں اتحاد ہوتا تو وہ اس اتحاد کے حفظ و بقا کے لیے دوسرے قبیلے کے بت کی بھی پرستش شروع کر دیتا، یہی وجہ تھی کہ بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بت جمع ہو گئے تھے، یعنی باہمی اتحاد و یگانگت کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ایک دوسرے کے خدا کی تعظیم کریں، چنانچہ یہی درخواست کفار قریش نے رسول اللہ سے کی۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ قریش نے کہا:

(الف) ہم آپ کو اتنا مال دے دیتے ہیں کہ مکہ میں آپ سے بڑھ کر کوئی دولت مند نہ ہوگا۔

(ب) ہماری لڑکیاں موجود ہیں، ان میں سے جو آپ کو پسند ہو اُس سے نکاح کر لیجئے۔

اور اس کے عوض میں آپ ہمارے بتوں کی مذمت نہ کیجئے، اور اگر یہ شرائط بھی منظور نہ ہوں تو پھر ہم یہ عرض کریں گے: تعبد الھتنا سنۃ، و نعبد الھک سنۃ، ایک سال تم ہمارے خداؤں کو پوجو، اور ایک سال ہم تمہارے معبود کی پرستش کریں گے، اس گفتگو کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورہ کافرون نازل فرمائی۔

جس قدر بت پرست اقوام ہیں، ان میں جو بتوں کی کثرت ہو جاتی ہے تو اُس کا یہی سبب ہے جو اوپر بیان کیا گیا، چنانچہ ایک جگہ قرآن میں آتا ہے: وقال انما اتخذتم من دون اللہ اوثانا مودۃ بینکم فی الحیوٰۃ الدنیا ثم یوم القیمۃ یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا وماوٰکم النار ومالکم من نصرین (۲۹: ۲۵) اور ابراہیم نے کہا کہ تم جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو لے بیٹھے ہو تو دنیا کی زندگی میں باہم دوستی کے لیے، مگر پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کی دوستی سے انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔

پس جب کفار قریش کے مطالبہ کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں تو نہایت ہی صاف اور غیر مشتبہ الفاظ میں یہ کہہ دیا گیا کہ اس وقت کفر و اسلام کا اتحاد ناممکن ہے۔

دائمی فیصلہ

(۴) وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۵) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔

اور میں پھر کہتا ہوں کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو اُن کی میں پرستش نہیں کروں گا، اور نہ تم اُس کی بندگی کرو گے جس کی میں بندگی کرتا ہوں

ان آیات میں اس علیحدگی اور انقطاع تعلقات کو اور زیادہ واضح اور روشن الفاظ میں بیان کر دیا کہ جس طرح اس وقت اتحاد باہمی ناممکن ہے، اسی طرح تم آیندہ کے لیے بھی یقین کر لو کہ ہم میں اور تم میں ائتلاف و یگانگت کی

کوئی صورت نہیں، اور ہم سے تم اپنی تمام توقعات کو منقطع کرلو۔

ان الفاظ میں نہ صرف برأت اور علیحدگی کا اعلان ہے، بلکہ لطیف طریق پر ان کے معبودان باطل کی برائی بھی ہے، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس طرح مخاطب کرکے فرمایا تھا: ماہذہ التماثیل التی انتم لہا عاکفون، قالوا وجدنا آبانا لہا عٰبدین، قال لقد کنتم انتم وآباءکم فی ضلل مبین (۲۱: ۵۲ تا ۵۴) یہ کیا مورتیں ہیں جن کی پرستش پر تم معتکف و قائم ہو، وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے، ابراہیمؑ نے کہا تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے رہے، اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۂ شعرا میں آیا ہے: فانہم عدو لی الا رب العالمین، وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین میرا دوست ہے۔

آخری اعلان

(۶) لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔ تم اپنے دین پر، اور میں اپنے دین پر۔

ان الفاظ نے اس فیصلہ پر مہر لگادی، اور یہ طے ہوگیا کہ کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ارباب ایمان کا اتحاد نہیں ہوسکتا۔

ادوار ثلثہ

ہر نبی اور داعی حق کو ان تین منازل میں سے گذرنا پڑتا ہے:

(الف) انذار و تبلیغ، یہ ولین منزل ہے، جب نبی اپنے مقاصد کا اعلان کرتا ہے، اس وقت متلاشیان حق تو اس کے ساتھ ہوجاتے ہیں، اور مخالفین اس سے بغض و عداوت کا اظہار کرتے ہیں: وانذر عشیرتک الاقربین، واخفض جناحک لمن اتبعک من المؤمنین، فان عصوک فقل انی بریٔ مما تعملون، (۲۶: ۲۱۴ تا ۲۱۶) اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنا دو، اور جو مومن تمہارے پیرو ہوگئے ہیں ان سے تواضع پیش آؤ، پھر اگر لوگ تمہاری نافرمانی کریں تو کہہ دو کہ میں تمہارے

اعمال سے بے تعلق ہوں۔

(ب) ہجرت الی اللہ، جب مخالفت بڑھ جاتی ہے تو اب اُسے ترک وطن اور ذہاب الی اللہ کی مقدس منزل طے کرنی پڑتی ہے، یہ ہجرت اگر ایک طرف ارباب قدس و طہارت کی فتح و کامرانی کی تمہید ہوتی ہے، تو دوسری جانب کفار و معاندین کی تباہی و بربادی کا بھی پیش خیمہ ہوتی ہے، اور درمیان کا زمانہ ان کے لیے ایک طرح کی مہلت کا وقت ہوتا ہے، اگر اصلاح کرلیں تو بہتر ورنہ بہت جلد ہلاک ہوجائیں گے، چنانچہ جب لوط علیہ السلام نے اپنے وطن کو ترک کردیا اور ان کی قوم کے لوگ فسق و فجور ہی میں مبتلا رہے تو فوراً ہلاک بھی کردیے گئے، جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی راہ لی اور کفار اپنی ہٹ پر قائم رہے تو ابتدائے غزوۂ بدر میں، اور انجام کار فتح مکہ کے روز ان کا نام و نشان بھی مٹا دیا گیا۔

(ج) فتح و کامرانی، ذہاب الی اللہ کے بعد رسول کی کامیابی ہی کامیابی ہے، فتح و ظفر اسکے ہم رکاب ہوتی ہے، اور نصرت بالرعب میسرۃ شہر کا ظہور ہونے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب سورۂ کفرون میں معاندین اسلام سے انقطاع تعلقات کرلیا گیا، تو فوراً بعد سورہ نصر نازل کرکے اہل ایمان کو فوز و فلاح کی بشارت دی، اور سورۂ تبت میں کفار کی شکست کا اعلان کردیا۔

یہ اعلان جنگ ہے

اس سورۃ کو بعض لوگوں نے صلح و آشتی پر محمول کیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں، اول تو اس کا نام ہی ظاہر کر رہا ہے کہ اب رسول کو ان لوگوں کی ہدایت کی امید رکھنا فضول ہے، اس لیے کہ انہوں نے کفر و بت پرستی پر قائم رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے، جیساکہ ہم شان نزول میں بیان کر چکے ہیں، اور متکبرین ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں، یہی جواب فرعون نے موسیٰ کو دیا تھا: قالوا سحران تظاھرا وقالوا انا بکل کافرون (۲۸ : ۴۸) کہنے لگے کہ دونوں جادوگر ہیں، ایک دوسرے کے موافق، اور بولے کہ ہم سب سے

منکر ہیں، سورۂ زخرف میں آتا ہی: ولما جاءہم الحق قالوا ہذا سحر وانا بہ کافرون (۳۰ : ۴۳) اور جب اُن کے پاس حق آیا تو کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہی اور ہم اس کو نہیں مانتے، سورۂ سبا میں فرمایا: وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوہا انا بما ارسلتم بہ کافرون وقالوا نحن اکثر اموالا واولادا وما نحن بمعذبین (۳۴ : ۳۴ و ۳۵) اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا، مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ جو چیز تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کے قائل نہیں، اور یہ بھی کہنے لگے کہ ہم بہت سا مال اور اولاد رکھتے ہیں، اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔

علاوہ ازیں مفسرین کرام نے اس سورۃ کے تین نام ذکر کیے ہیں اور تینوں انقطاع تعلقات اور اعلان جنگ کو ظاہر کرتے ہیں:

(۱) المنابذہ، سورۂ توبہ میں کفار کے عہود کے متعلق آتا ہی: واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیہم علی سواء، لفظ نبذ کے معنی پھینکنے کے ہیں گویا اس سورۃ میں بھی کفار کے عہود ومواثیق کو انہی پر پھینک دیا گیا ہی، اور ان سے کہہ دیا گیا ہی کہ اب ہمیں تم سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) الاخلاص، اس نام کا بھی اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں کہ مسلمانوں اور کافروں کی جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز کر دیا جائے نبی اسی تفریق وامتیاز کے لیے آتا ہی کہ کسی قسم کا شک واشتباہ باقی نہ رہے: ولیمحص اللہ الذین آمنوا ویمحق الکافرین۔

(۳) المقشقشہ، اس کا مطلب یہ ہی کہ ناپاکی سے قطع تعلق اور طہارت وپاکیزگی کا وقت قریب آگیا ہی۔

پس یہ تینوں نام اس حقیقت پر مہر لگا دیتے ہیں کہ موضوع سورت کافرون سے انقطاع تعلقات ہی۔

لکم دینکم ولی دین

جس طرح کہ گذشتہ اسماے سورت اپنا مطلب آپ واضح کر رہے ہیں اسی طرح سورت کی آخری

آیت بھی ہر قسم کے غبار شک و اشتباہ کو دور کر دیتی ہے، اور یہ الفاظ بالکل ایسے ہی واقع ہوئے ہیں، جیسے سورۂ یونس میں فرمایا گیا ہے: وان کذبوک فقل لی عملی ولکم عملکم، انتم بریئون مما اعمل و انا بری مما تعملون (۱۰: ۴۱) اور اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو کہہ دو کہ مجھ کو میرے اعمال کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے اعمال کا، تم میرے اعمال کے جوابدہ نہیں ہو، اور میں تمہارے عملوں کا جوابدہ نہیں ہوں، ایسے ہی حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو مخاطب کیا تھا: اننی براء مما تعبدون الا الذی فطرنی، فانہ سیہدین، وجعلہا کلمۃ باقیۃ فی عقبہ لعلہم یرجعون (۴۳: ۲۶ تا ۲۸) جن چیزوں کو تم پوجتے ہو، میں ان سے بیزار ہوں، ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھے سیدھا رستہ دکھائے گا اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔

پس اس سورۃ کا موضوع اور مضمون انقطاع تعلقات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

النصر

تین آیات

تمہید

اس میں فتح مکہ، مسلمانوں کی نصرت وکامرانی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اعلان کیا گیا ہے۔



فوز وظفر کا اعلان

نصرت الٰہیہ کا اظہار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ (۲) وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (۳) فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕؔ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا

جب خدا کی مدد آ پہنچی، اور فتح حاصل ہو گئی، اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور اسی سے مغفرت مانگو، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل عرب میں اسلام پھیلانے کی سعی و کوشش شروع کی تو عام طور پر لوگوں نے آپ کی طرف توجہ نہ کی، بلکہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ اس وقت ان لوگوں سے برسرپیکار ہیں جو اشرف ترین عرب ہیں، ہم اس جنگ کے نتائج کو خاموشی سے دیکھتے ہیں جو غالب ہوگا اسی کا ہم ساتھ دیں گے کیونکہ وہی حق و صداقت پر ہوگا، گویا انہوں نے مکہ مبارکہ کے فتح و سقوط کو معیار حقانیت قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے بھی اسی فتح مکہ کو صداقت کا نشان تسلیم کر کے فرمایا کہ جس وقت نصرت الٰہیہ کا ظہور ہو، مکہ پر مسلمانوں کا غلبہ ہو جائے اور لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہونے لگیں تو سمجھ لو کہ تم نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا، اس فتح سے قبل تو لوگ انفرادی طور پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے تھے مگر اس کے بعد یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک ایک دن میں کئی کئی قبائل مدینہ میں حاضر ہو کر اسلام کا اظہار کرتے، اور واپس جا کر دوسروں کے اسلام کا ذریعہ بنتے۔

اعلان وفات

اِس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لیئے اور قیامت تک کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجے گیے ہیں، مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ بشر ہیں، اور آپ کی ذات اقدس میں بشریت کے تمام صفات و مخصصات بھی موجود ہیں، وقت معین پر آپ اس دنیا سے ملاء اعلیٰ کی طرف بھی تشریف لے جانے والے ہیں، اس لیئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے فرائض نبوت کی تحدید کر دی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کی حیات مقدس میں عرب کا دار الحکومت مکہ فتح ہو گیا جو تمام ملک کا مرکز اور ام القری ہے، اور جہاں سے اطراف و جوانب ملک میں نہایت ہی سہولت اور آسانی کے ساتھ اسلام کی آواز پہنچ سکتی ہے، تو گویا آپ نے تبلیغ رسالت کا فرض ادا کر دیا، بقیہ حصص دنیا میں آپ کے اصحاب و حوارین اس آواز کو پہنچا دینگے، جنھیں آپ نے اس فرض جلیل کے لیے تیار کر دیا ہے۔

پس جب مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، اور تمام قبائل عرب نے یکے بعد دیگرے دائرۂ اسلام میں داخل ہونا شروع کر دیا تو گویا آپ اپنے مقصد رسالت سے فارغ ہو گئے، اس لیے حکم ہوا کہ آپ اپنا تمام وقت اللہ کی تحمید و تقدیس اور توبہ و انابت الی اللہ میں صرف کیجیے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس سورۃ کے نازل ہونے پر آپ رکوع و سجود میں سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی بہت پڑھا کرتے تھے، اسی سورۃ کے سننے پر ابوبکرؓ رو پڑے تو لوگ حیران رہ گئے، مگر جب تھوڑی سی مدت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اس وقت صحابہ کو معلوم ہوا کہ اس میں آپ کی وفات کا اعلان تھا، اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے خوب واقف تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ بعض صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ آپ ابن عباس کو ہمارے برابر کیے دیتے ہیں حالانکہ اُس کی عمر کے درجہ کے ہمارے لڑکے ہیں، اس پر حضرت عمر نے ان لوگوں کو ابن عباس کے ساتھ بلایا اور کہا: ما تقولون فی قول اللہ عز وجل اذا جاء نصر اللہ والفتح، فقال بعضہم امرنا ان نحمد اللہ ونستغفرہ اذا نصرنا وفتح علینا، وسکت بعضہم فلم یقل شیئا فقال لی اکذلک تقول یا ابن عباس

فقلت لا، فقال ماتقول؛ فقلت ہو اجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلمہ لہٗ قال اذا جاء نصر اللہ والفتح فذلک علامۃ اجلک فسبح بحمد ربک واستغفرہ، انہ کان توابا، فقال عمر بن الخطاب لا اعلم منہا الا ماتقول (بخاری) سورۂ نصر کی کیا تفسیر کرتے ہو بعض تو بالکل خاموش رہے مگر دوسروں نے کہا کہ فتح و نصرت کے وقت ہمیں حمد و استغفار کا حکم دیا گیا ہے، پھر انھوں نے یہی سوال مجھ سے کیا تو میں نے کہا کہ فتح مکہ کو رسول اللہؐ کی وفات کی علامت قرار دیا گیا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میری بھی یہی رائے ہے۔

دوسری توجیہ

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ ارباب قدس و طہارت کو فتح و کامرانی کی بشارت دیتا ہے مگر اس مسرت اندوز خبر کی تکمیل میں بہت دیر لگ جاتی ہے، اس درمیان میں تکالیف و مصائب کے بادل چھا جاتے ہیں، ناکامیاں اور مایوسیاں سامنے آتی ہیں، اور کبھی کبھی یہ خیال بھی دل میں آنے لگتا ہے کہ شاید یہ وعدہ ہی غلط نہ ہو، اس لیے اس سورۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت تمام مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ فتح و نصرت میں تاخیر ہونے کی وجہ سے جو رنج و غم تم لوگوں کو لاحق ہوا ہے، اس کے لیے اللہ سے استغفار کرو، توبہ و انابت الی اللہ کی راہ اختیار کرو اور دعا کرو کہ باطل کو فنا کرنے کے واسطے اللہ حق کو قائم و دائم رکھے، وہ اگر عارضی طور پر مسلمانوں کو امتحان میں ڈال رہا ہے تو یہ خیال ہرگز دل میں نہ لاؤ کہ وہ تمہاری سعی و کوشش کو ضائع کرے گا: ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین، وہ تواب ہے تکلیفوں اور محنتوں کی صورت میں اپنے بندوں کی تعلیم و تربیت کرتا ہے اور یہ سلسلہ برابر قائم رہتا ہے تا آنکہ وہ درجہ کمال کو حاصل کر لیتے ہیں، پس اب فتح مکہ کی وجہ سے خوف دور ہو گیا اور تمہارا کام تسبیح و تقدیس کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔

اللهب

پانچ آیات

تمہید

اِس سورت میں ابولہب اور اس کی بیوی کی ہلاکت و بربادی بیان کرکے یہ واضح کیا ہے کہ
جو لوگ اسلام کی مخالفت کریں گے تو نہ صرف وہی تباہ ہوں گے بلکہ وہ لوگ بھی دوزخ میں
داخل ہوں گے جو اُن کے شرکا رکار تھے پس جس طرح سورۂ نصر میں مسلمانوں کی کامیابی کا اعلان
کیا گیا ہے، ویسے ہی اس سورۃ میں کفار و معاندین اسلام کی ذلت و رسوائی ذکر کی گئی ہے۔



کفار کی ہزیمت

ابولہب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱) تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۲) مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ وَمَا کَسَبَ (۳) سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۴) وَّامۡرَاَتُهٗ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ (۵) فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ۔

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو، نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا، اور نہ وہ جو اس نے کمایا، وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا اور اس کی جورو بھی جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے، اس کے گلے میں مونج کی رسی ہوگی۔

تب دراصل تباب سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں: وما کید فرعون الا فی تباب، ید کے معنی دونوں ہاتھ کے ہیں، مگر مراد اس سے خود اس شخص کا خسران خذلان ہے، ہاتھ ہی پکڑنے اور کام کرنے کا ذریعہ ہے، جب ٹوٹ گئے تو گویا وہ خود ہی معدوم ہوگیا، چنانچہ اس کے بعد لفظ تب بول کر بتا دیا کہ اس سے مراد ابولہب کی تباہی ہے، لہب جب آگ خوب روشن ہو جائے اور شدت حرارت کی وجہ سے اس میں شعلے نکلنے لگیں تو ان شعلوں کو لہب کہتے ہیں اس سے مراد شدید الحرارت آگ ہے، حمالۃ الحطب حطب ایندھن کو کہتے ہیں، ابولہب کی بیوی کا نام ام جمیل تھا، وہ لوگوں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چغلیاں کھایا کرتی [illegible] قبائل عرب آپ کے [illegible]

ہو جائیں، اور اس طرح آپ کے خلاف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھے، جید گردن جبل رسی اور مسد
مونج کو کہتے ہیں۔

ابو لہب کا اصلی نام عبد العزیٰ بن عبد المطلب ہے، یہ رسول اللہ کا چچا اور آپ کا شدید ترین دشمن تھا،
جب قرآن میں یہ آیت نازل ہوئی: وانذر عشیرتک الاقربین تو آپ پہاڑی پر تشریف لے گئے، اور
تمام قبائل قریش کو جمع کر کے فرمایا: ارایتم ان حدثتکم ان العدو مصبحکم او ممسیکم، الکنتم تصدقونی، اگر
اگر میں تم سے یہ کہوں کہ دشمن تم پر صبح یا شام کو حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم میری تصدیق کرو گے
سب نے کہا ضرور، اس پر آپ نے فرمایا: فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید، تو پھر یہ سمجھ لو کہ میں اس
عذاب سے تم کو ڈراتا ہوں جو میری آنکھوں کے سامنے ہے، ابو لہب نے یہ سن کر کہا: الهذا جمعتنا تبالک،
تم ہلاک ہو، کیا تم نے اسی لیے ہم سب کو جمع کیا تھا، (بخاری)

مسند امام احمد میں ربیعہ بن عباد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی
قبیلۂ عرب کو توحید کی دعوت دیتے، اور انھیں بت پرستی چھوڑنے کو کہتے، تو جب آپ اپنی تقریر ختم
کر چکتے تو ایک شخص یہ کہتا کہ بدعت ضلالت کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں، یہ تمھیں لات و عزیٰ چھوڑنے
کو کہتا ہے، اس کی بات پر کان نہ دھرو، ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا، یہ کون شخص
ہے، اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ آپ کا چچا ابو لہب ہے۔

اس سورت میں ابو لہب کا نام خاص طور سے لیا گیا ہے، حالانکہ مخالفین اور بھی تھے، اس کی وجہ
یہ ہے کہ آپ کی تکذیب میں سب سے زیادہ اسی بدبخت کا حصہ تھا، یہی برابر آپ کے تعاقب میں رہتا،
جس قبیلہ میں آپ تبلیغ کے لیے جاتے یہ بھی آپ کے ساتھ ہوتا، لوگوں کو راہِ حق سے روکتا، اور ایسے
اسباب پیدا کرتا کہ کسی کو قرآن میں درس مطالعہ کا شوق ہی نہ ہو۔

ابو لہب پر اس سورت میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ مال و دولت کے غرور باطل میں وہ

کلمۂ حق کی مخالفت نہ کرے ورنہ جب ہمارا عذاب اس کی طرف متوجہ ہوگا تو اس میں سے کوئی چیز بھی اس کی نجات کا باعث نہ بن سکے گی پھر اس وقت نہ صرف وہ دوزخ میں داخل کیا جائے گا بلکہ اس کی بیوی بھی اس کے ہمراہ ہوگی، کیونکہ باطل کو فروغ دینے اور حق کو مٹانے میں وہ اس کا دست راست تھی اور ہر طرح اس کی معاون و مددگار تھی۔

درس عبرت

آج جو لوگ اسلام کی مخالفت کرتے ہیں اسلامی حکومتوں کے فنا کرنے کے منصوبے باندھتے ہیں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا ان کا نصب العین ہے وہ اس سورت سے سبق اندوز ہوں وہ یاد رکھیں کہ جس طرح ابولہب اور اس کے رفقاء کار کا نام و نشان مٹ گیا، اور ان کی دولت و ثروت ان کے کچھ کام نہ آئی، اسی طرح آج بھی وہ منتقم و جبار زندہ ہے اس کے قانون تعذیب امم میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، وہ عنقریب تم میں سے ایک ایک کو فنا کر دے گا، اور اس وقت تمہارے جنود مجندہ کچھ کام نہ آئیں گے۔

نہ صرف ائمہ کفر و ضلالت ہی برباد ہوں گے بلکہ وہ لوگ بھی جو سرًا یا علناً ان دجاجلہ و شیاطین عصر کی امداد و اعانت کرتے ہیں اور انھوں نے بھی مسلمانوں کی تباہی کو اپنا مقصد بنا لیا ہے، ایسے بدبختان نوع انسانی ابولہب کی بیوی کے انجام سے عبرت اندوز ہوں ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار

الاخلاص

چار آیات

تمہید

اس سورت میں توحید خالص اور اسلام کا مقصد وحید ظاہر کر کے تمام ان مذاہب کا رد کیا ہی جو کسی نہ کسی شکل میں خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔



توحید خالص

اللہ کی وحدانیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ (۲) اَللّٰہُ الصَّمَدُ (۳) لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (۴) وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔

کہو کہ وہ ذات پاک جس کا نام اللہ ہے ایک ہے اور وہ معبود برحق بے نیاز ہے نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا، اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

مسلمانوں کی نصرت و کامرانی، اور کفار کی ذلت و رسوائی کے بعد آخر میں پھر ایک مرتبہ اصل واساس اسلام وعصارۂ ایمان کا ذکر کیا جاتا ہے، اور وہ توحید خالص ہے جس پر تمام انبیاے کرام متفق ہیں، دنیا میں مختلف چیزیں اپنے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں، ہر ایک کا تعلق اپنے اپنے مرکز سے ہے، اور پھر یہ تمام مراکز مختلفہ ایک بالاتر ہستی میں جاکر جذب ہو جاتے ہیں، وہی اعظم ترین مرکز اللہ ہے، زمین و آسمان میں جس قدر انوار و برکات مصروف عمل ہیں سب اسی ایک سرچشمۂ فیض سے مستعار لیے گئے ہیں، وہاں محض خیر ہی خیر ہے، اس جگہ شر و فساد کا نام ونشان تک نہیں، وہی اللہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ملکوت السموات والارض ہے، جس کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔

احد اور واحد

اگرچہ خلیل کی یہ رائے ہے کہ احد اور واحد میں کوئی فرق نہیں، مگر جمہور علماء کے نزدیک دونوں

کے معانی الگ الگ ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ لایقاومہ احدٌ تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کوئی شخص بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن اگر احد کی جگہ واحد کا لفظ استعمال کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک شخص تو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، البتہ اس سے زائد کر سکتے ہیں، ازہری کی رائے یہ ہے کہ احدیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے، دوسرا اس سے متصف نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام مقام احدیت اور واحدیت میں فرق کرتے ہیں۔

اللہ الصمد

مفسرین کرام نے صمد کے مختلف معانی بیان کیے ہیں، امام فخرالدین رازی نے اسکے متعلق اٹھارہ اقوال نقل کیے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ صمد کا لفظ اتنا وسیع ہے کہ وہ ان تمام معانی پر حاوی ہے، یہ مختلف صفات ہیں جو ان حضرات نے بیان کیے ہیں، ایک روایت میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صمد کے معنی دریافت کیے گئے تو آپ نے فرمایا: السید الذی یصمد الیہ فی الحوائج، "وہ سردار جس کی طرف حاجتوں اور ضرورتوں کے وقت قصد کیا جائے۔"

اس تفسیر کے بعد ہر مسلمان کے لیے راہ عمل معین ہو جاتی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہر ضرورت کے وقت صرف اللہ ہی کے آگے دست سوال دراز کرے، اپنے اوپر ایاک نعبد وایاک نستعین کی حقیقت طاری کرلے، اس لیے کہ غیر اللہ سے اعانت کا طالب ہونا اور انسانوں کے آگے اپنی حاجات پیش کرنا بالکل ممنوع اور ناجائز ہے، بعض لوگ علماء و مشائخ کی طرف رجوع کرتے ہیں، کچھ لوگ پیغمبروں اور فرشتوں سے طالب اعانت ہوتے ہیں، مگر اللہ الصمد کے ہوتے کسی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

بعض حضرات نے صمد کے معنی ٹھوس کے کیے ہیں یعنی اس پر کوئی تغیر نہیں آتا، اور وہ اپنی ذات میں قوی اور مستقل ہے، وہ واجب الوجود ہے، شروع سے ہے اور ہمیشہ رہے گا وہی سردار، آقا اور

شہنشاہ ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں اور وہی تمام فضائل کمالات کا جامع ہے۔

برابری کا دعویٰ

عام طور پر اللہ کے متعلق لوگوں کے خیالات یہ ہیں:

(۱) عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور جنات کو اُس کا رشتہ دار کہتے تھے، نجوم و کواکب کی پوجا کرتے اور ان کے ناموں پر معبد بنا رکھے تھے۔

(۲) ہندوؤں کی اس وقت تک یہی حالت ہے، ہزاروں معبودان باطل ہیں جن کے نام پر انھوں نے اپنے مندر بنا رکھے ہیں اور جن میں اگر ایک طرف رام اور ہنومان کی پوجا ہوتی ہے تو دوسری جانب مہادیو اور اُس کے لنگ کے آگے بھی سر بسجود ہوتے ہیں، وہ اسی گمان باطل میں ہیں کہ بت پرستی کے بغیر انسانی ارتقاء غیر ممکن ہے۔

(۳) یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور ان کا اپنی نسبت یہ دعویٰ ہے:

نحن ابناء اللہ واحباؤہ۔

(۴) عیسائی بھی ان کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اب، ابن، اور روح القدس کو خدا مانتے ہیں اور ہر ایک کو برابر کا خدا تسلیم کرتے ہیں۔

سورۂ اخلاص ان تمام عقائد باطلہ کا صاف صاف رد کرتی ہے اور ببانگ دہل پکارتی ہے:

لم یلد، وہ کسی کا باپ نہیں، اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اُس کی جانشینی کا حق ادا نہیں کر سکتی۔

ولم یولد، اس کا باپ بھی کوئی نہیں، جو اس سے بالاتر ہو۔

ولم یکن لہ کفواً احد، نہ اس کے کوئی برابر ہے، جو اس کا نعم البدل قرار دیا جا سکے۔

نتیجہ

جب خداوند قدوس سے اعلیٰ، اُس کے برابر، اور اُس کے قائم مقام کوئی قوت نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لا الہ الا اللہ، دنیا میں جس قدر بادشاہ و حکمراں ہیں، ان سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے، گویا ایک ادنےٰ ترین انسان اور شہنشاہ اعظم دونوں برابر ہیں، اس اسلامی توحید کو مان لینے کے بعد ہر شخص کی ہمت بڑھ جائے گی، اور اس کے دل میں امنگ پیدا ہوگی کہ میں ترقی کرکے بادشاہ کے درجہ تک پہنچ جاؤں، پس دنیا میں اگر کوئی عقیدہ اعلیٰ ترین ہمت و استقلال، اور ولولۂ عمل پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف عقیدۂ توحید ہے، اور اس کو اصلی صورت میں صرف اسلام ہی نے پیش کیا ہے۔

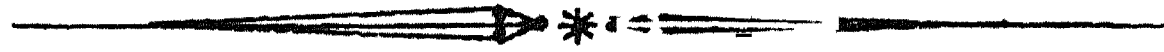


الفلق

(پانچ آیات)

تمہید

مقصد اسلام گذشتہ سورت میں بیان کیا گیا ہے، اب سورۂ فلق اور سورۂ ناس میں اس کے حفظ و بقا، اور ثبات و استقامت کی دعا مانگی گئی ہے، سورۂ فلق میں تمام اُن مضرات سے بچنے کی دعا تعلیم دی گئی ہے جو جسم کو نقصان پہنچانے والی ہیں، سورۂ ناس میں اُن اشیاء سے پناہ مانگی جائے گی جو روح کے لیے نقصان کا باعث ہوتی ہیں۔



جسمانی مضرات سے تعوذ

توطیہ وتمہید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) قُلْ اَعُوْذُ	کہو کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں ہر چیز کی
بِرَبِّ الْفَلَقِ (۲) مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۳)	برائی سے جو اس نے پیدا کی اور شب تاریک کی برائی سے
وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۴) وَمِنْ	جب اس کا اندھیرا چھا جائے، اور گنڈوں پر پڑھ پڑھ کر
شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۵) وَمِنْ شَرِّ	پھونکنے والیوں کی برائی سے اور حسد کرنے والے کی
حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔	برائی سے جب حسد کرنے لگے۔

فلق کے لغوی معنی جدا ہونے کے ہیں، چونکہ صبح بھی رات سے جدا ہوتی ہے اس لیے اب اس کے معنی صبح ہی کے آتے ہیں، چنانچہ جابرؓ ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور سعید بن جبیر کی یہی رائے ہے، غاسق، یہ لفظ غسق سے لیا گیا ہے اور اس سے مراد رات ہے، وقب کے معنی داخل ہونے کے ہیں، نفاثات لیا گیا ہے نفث سے، یہ مبالغہ کا صیغہ ہے مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے، اس کے معنی آہستہ سے پھونک مارنے کے ہیں جب ایک پودا زمین سے سر نکالتا ہے، تو ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ان آفات و بلیات سے اس کو بچانے کی کوشش کی جائے جو اس کو بالکل نیست و نابود کر دیتے ہیں، ان آفتوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) بعض جانور اسی تلاش میں ہر وقت پھرتے رہتے ہیں کہ سبزہ زار ملے تو اپنا پیٹ بھریں، چنانچہ وہ ہر پودے کو کھا جاتے ہیں، اس لیے پودے کے گرد اگرد کانٹوں کی باڑھ لگانی پڑتی ہے کہ ان جانوروں کی دست برد سے محفوظ رہے۔

(۲) اس امر کی ضرورت ہو کہ اس کو پانی اور کھاد وقت پر ملے اگر تھوڑی سی بھی تاخیر ہو گئی تو وہ مرجھا جائے گا۔

(۳) ناگہانی طور پر کوئی مصیبت آجاتی ہو، مثلاً شب کے وقت مالک تو آرام سے سو رہا تھا، اور یہاں طوفان باد و باراں نے اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔

(۴) ایک شخص مالک کا دشمن ہو مگر مالک اتنا طاقتور ہو کہ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا اس لیے وہ اپنا تمام غصہ اس پودے پر نکالتا ہو اور اسے کاٹ ڈالتا ہو۔

پودا جب تک ان آفات و مصائب سے محفوظ نہ رہے گا اس سے فائدہ اٹھانے کی کوئی صورت نہیں

رجوع الی المقصود۔

اس قدر تمہید کے بعد اب آپ اصل سورت میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمیں چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہو:

خلاف فطرت سے پناہ

(۱) ہر چیز کا وجود فی نفسہٖ اس کائنات ارضی و سماوی کے لیے نہایت ہی مفید اور نافع ہو اس میں ضرر اور نقصان کا پہلو اس وقت آتا ہو جب اس کی نسبت دوسری چیز کی طرف ہو تلوار کی بہترین صفت یہی ہو کہ وہ تیز ہو، مگر جب اس سے کسی کی گردن کٹ جائے تو کہیں گے کہ یہ تلوار بُری ہو کیونکہ اس سے ایک انسان کی زندگی ختم ہو گئی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزیں پیدا کر رکھی ہیں جو فی نفسہ مفید ہیں مگر وہ فرزند آدم کی فطرت کے بخط مستقیم مخالف ہیں، وہ جب اس پر حملہ آور ہوتی ہیں تو اُسے جادۂ اعتدال سے منحرف کر دیتی ہیں اور اس کے مقاصد حیات کے کسب و حصول میں رکاوٹ بن جاتی ہیں ان کے مضر اثرات و نتائج سے بچنے کے لیے تعلیم دی گئی کہ تم یوں اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ اے خداوندا! تو تاریکی سے

روشن صبح نکالتا ہے پس تو ہی ہمیں ان خلاف فطرت اشیاء کی ظلمت سے محفوظ رکھ۔

ضروریات زندگی فراہم ہوں۔

(۲) چاند کی روشنی اور ٹھنڈک پودوں کی نشوونما بالیدگی میں ایسے ہی معاون و مددگار ہوتی ہے جس طرح سورج کا نور اور اس کی حرارت اگر چاند طلوع نہ کرے اور تمام شب تاریک ہی رہے تو پودے پوری قوت کے ساتھ نشوونما حاصل نہ کرسکیں گے۔

اسی طرح اگر ایک شخص اپنے فرائض حیات تو ادا کرنا چاہتا ہے، مگر افلاس و ناداری کی وجہ سے مجبور ہے کہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کی بھی فکر کرے لیکن اگر وہ اپنی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں مصروف ہوگیا تو مقصد اصلی سے ہٹ جائے گا اور روپیہ کمانے ہی میں اپنا تمام وقت صرف کردے گا۔

آیت ومن شر غاسق اذا وقب میں اسی سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے ایسا نہ ہو کہ ہم تو اپنی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں لگ جائیں اور اس کی وجہ سے ہماری قوم اور ملک کو سخت نقصان پہونچے پس اے مالک الملک! تو ہی ہماری ضروریات کو پورا کر اور ان کے فراہم کرنے کی وجہ سے جو ضرر ملک و ملت کو پہنچ سکتا ہے اس سے محفوظ رکھ، ایسا نہ ہو کہ ان چیزوں میں پھنس کر ہم اپنا مقصدِ حیات ہی فراموش کردیں اور اس طرح پھر کہیں کے بھی نہ رہیں۔

ناگہانی آفات

(۳) ہم ایک عزم صمیم کرلیتے ہیں، ملک و ملت کی خدمت کو اپنا مقصد حیات بنا لیتے ہیں، اور کلمۃ الحق کی فضیلت و برتری کو اپنی غایۃ الغایات قرار دے لیتے ہیں، اتنے میں ناگہانی طور پر ہمارے عزیز و قریب، دوست احباب اور بیوی بچے آجاتے ہیں اس راہ کی مشکلات و موانع کا ذکر کرتے ہیں تکالیف و شدائد کی ہولناک تصویر کھینچ دیتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے ارادے

سے باز آجائیں، اسے کمزور کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، تا آنکہ بسا اوقات ان کے غیر محسوس اثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس مقصد کو بالکل ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

پس اے صبح کے روشن کرنے والے خدا! انما اموالکم واولادکم فتنۃ کے شر و فساد سے بچا انکے اثر بد سے محفوظ رکھ اور مجھے ایسا عزم راسخ، قلب صمیم، اور پختہ ارادہ نوازش فرما کہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں، دریا اپنا رستہ تبدیل کرلیں، اور آبادیاں بن ہوجائیں، مگر میں اپنے مقصد سے ایک انچ بھی نہ ہٹوں، اور اسی پر اپنی جان دے دوں یہی مطلب ہے ومن شر النفثت فی العقد کا۔

حاسد سے بچا

(۴) بعض لوگ ہماری کامیابیوں اور کامرانیوں سے ناخوش ہوتے ہیں، غصہ میں آکر اپنا ہاتھ کاٹ لیتے ہیں، ہمیں ذلیل و رسوا کرنے کے لیے منصوبے باندھتے ہیں، سازشیں کھڑی کرتے ہیں ہمارے ہی آدمیوں کو خفیہ امداد دے کر ہماری مخالفت پر کھڑا کر دیتے ہیں کہ ہماری حکومتیں برباد ہوں اور ہلال کی جگہ صلیب کی فرماں روائی ہو۔

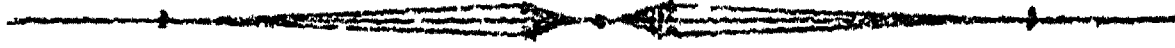
پس اے رب الارباب! اور اے خداوندوں کے خداوند!! تو ان کے شر و فساد سے پناہ میں رکھ، ان کی سازشوں کو طشت از بام کر، ان کے منصوبوں کو کامیاب ہونے نہ دے، ان کے ارادوں میں کمزوری پیدا کر، تیری تائید ہمارے شامل حال ہو، ہم دن دوگنی رات چوگنی ترقی کریں، اور ہمیں ہر جگہ فتح و کامرانی نوازش فرما۔

الناس

(چھ آیات)

تمہید

گذشتہ سورۃ میں جسمانی مضرتوں سے پناہ مانگنے کے لیے تعلیم دی گئی تھی، اس میں روحانی نقصانات سے بچنے کی دعا بتائی گئی ہے، یہ ضرر پہنچانے والے انسان ہوں یا جن، سب سے تعوذ کیا گیا ہے، اور اللہ کی تین صفات سے اعانت طلب کی گئی ہے۔



روحانی مضرات سے تعوذ

شدید ترین دشمن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۱) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۲) مَلِكِ النَّاسِ (۳) اِلٰهِ النَّاسِ (۴) مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۵) الَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۶) مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔

شروع خدا کا نام لیکر جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہی، کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں یعنی لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی لوگوں کے معبود برحق کی شیطان وسوسہ انداز کی برائی سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہی خواہ وہ جنات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔

اس سورت میں اس دشمن سے پناہ مانگی گئی ہی جو خود ہمارے اندر ہی جسے ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں: یا بنی آدم لا یفتننکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنۃ ینزع عنہما لباسہما لیریہما سوآتہما انہ یراکم ہو وقبیلہ من حیث لا ترونہم، انا جعلنا الشیطین اولیاء للذین لا یومنون (۷: ۲۷) اے بنی آدم: دیکھنا کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر بہشت سے نکلوا دیا اور ان سے ان کے کپڑے اتروا دیے تاکہ ان کے ستر ان کو کھول کر دکھا دے، وہ اور اس کے بھائی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے رہتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے ہم نے شیطانوں کو انہیں لوگوں کا رفیق بنایا ہی جو ایمان نہیں رکھتے

انسان میں اصل اور حقیقۃ الحقائق کے اعتبار سے علوم اور اخلاق ہیں ان کا شدید ترین دشمن یہی شیطان ہی جس کا ذکر اوپر آیا ہی جس کا اثر خاموش مگر دیرپا ہی، جو گھن کے کیڑے کی طرح

اندر ہی اندر روح انسانی کو کھا جاتا ہے۔

صفاتِ الٰہیہ

جب فرزندِ آدم کرۂ ارضی پر قدم رکھتا ہے تو ماں باپ اُس کی نشو و تربیت میں لگ جاتے ہیں، یہ اُسکا اولین تعلق ہے، وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی تمام آرزوؤں اور توقعات کا مرکز یہی ماں باپ ہیں، مگر جب عمیق غور و فکر سے کام لیتا ہے تو اُس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ محض ذرائع و وسائل ہیں، ان کی معرفت مجھے رزق ملتا ہے اور میری پرورش ہوتی ہے ورنہ اصل میں ربُ الناس ہے جو میری تمام ضروریات کا ذمہ دار و کفیل ہے جس نے میری خاطر چاند، سورج، پہاڑ، سردی، گرمی، دن اور رات کو بنایا ہے، اس لیے جب ابن آدم پر اس کا دشمن حملہ کرتا ہے تو طبعی طور پر وہ اسی رب کی طرف رجوع کرتا ہے جس نے اُس کی جسمانی تربیت کا سامان کیا ہے کہ وہی اُس کی روحانی نشو و ارتقا کے اسباب بھی فراہم کرے۔

مگر جب ہی انسان بڑا ہوتا ہے، عہدِ شباب میں قدم رکھتا ہے اور حاکمِ وقت سے اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میرا بادشاہ مجھے ہر دشمن سے بچانے کے لیے کافی ہے، لیکن بہت جلد اس کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ روئے زمین کے تمام فرمانروایان عاجز محض ہیں، ان لوگوں کی حکومت صرف اجسام تک ہے، پس وہ ان سب سے کٹ کر زمین و آسمان کے شاہنشاہ کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اے تمام انسانوں کے بادشاہ مجھے دشمن سے بچا لے۔

پہلی دو صورتوں میں تو ممکن ہے کہ انسان اپنی کوتاہ بینی سے نظر کو زیادہ بلند نہ کرے اور اربابِ دنیا ہی کو اپنا آخری چارہ کار خیال کر لے مگر اس کا دشمن اپنے خدع و فریب میں برابر مصروف ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اُسے چین نہیں لینے دیتا، اس لیے اب وہ اپنے معبودِ حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اُس کے

سوا کوئی ذریعۂ نجات نہیں۔

پناہ کی طلب

پس ایک عاجز و درماندہ انسان اپنے رب اپنے بادشاہ اور اپنے معبود کو پکارتا ہے کہ اے ہم سب کے پرور دگار! اے ہم سب کے شاہنشاہ!! اور اے ہم سب کے معبود!!! تیری توفیق کے ہم طلب گار ہیں ملک و ملت کی خدمت اور کلمۃ الحق کے بلند و برتر کرنے کا جذبۂ صادقہ نوازش فرما، اس راہ میں جو رکاوٹیں پیدا ہوں جس قدر خیالات فاسدہ اور بری حرکتیں سدراہ ہوں ان سب سے ہمیں محفوظ رکھنا، ان لوگوں سے بچا جو ہمارے ارادوں میں تزلزل پیدا کرنے کی کوشش کریں جنات اور انسانوں سے ظاہری اور باطنی دشمنوں سے ہماری نگہداشت کر ان میں سے کوئی چیز بھی ہم پر اثر نہ ڈال سکے، ہم اپنے مقصد حیات میں پورے کامیاب ہوں اور قلب سلیم لے کر تیرے دربار میں حاضر ہوں۔

ابتدا اور انتہا۔

قرآن پاک کی ابتدا الحمد للہ رب العالمین سے ہوئی اور اس کا خاتمہ رب الناس، ملک الناس، الٰہ الناس پر ہوا، اور اس طرح لطیف طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب عزیز کسی ایک ملک آب و ہوا، اور رنگت و نسل کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ یہ تمام مذاہب و ادیان اور اقوام و ملل کے لیے ہے، اور اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ دنیا کے تمام لوگوں کو شعوب و قبائل، وطنی اور قومی تعصبات اور جنسی جذبات و عواطف سے پاک و صاف کر کے ایک عالم گیر برادری میں منسلک کر دے جس میں اسود و احمر اور زنگی و رومی کی کوئی تمیز نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع والمآب و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین، وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ و صحبہ اجمعین الی یوم الدین، آمین یا رب العالمین۔